بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (الآیۃ)

نصرۃ الحدیث

"... جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا"

حکیم الامت حضرت تھانوی

مؤلفہ

محدث جلیل حضرت مولانا ابو المآثر حبیب الرحمن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

باہتمام

(مولانا) رشید احمد الاعظمی

مدیر

دار المآثر الاسلامیۃ

پوسٹ بکس ۱۵، مئو ۲۷۵۱۰۱، یو۔پی انڈیا

فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم (الآیۃ)

نصرۃ الحدیث

"جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا
کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہیں لکھ سکتا"
حکیم الامت حضرت تھانوی

مؤلفہ

محدث جلیل حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

باہتمام

(مولانا) رشید احمد الاعظمی

مدیر

دار المآثر الاسلامیۃ
پوسٹ بکس ۱۷، مئو ۲۷۵۱۰۱، یو۔ پی انڈیا

نصرۃ الحدیث

نام کتاب	:	نصرۃ الحدیث
تصنیف	:	محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی
صفحات	:	۲۱۵
سن اشاعت	:	۱۴۲۵ھ = ۲۰۰۴ء
طبع چہارم	:	گیارہ سو
قیمت	:	
ناشر	:	دارالمآثر الاسلامیہ، مئو

ملنے کا پتہ

مرقاۃ العلوم - پوسٹ بکس نمبر ا

مئوناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱

یوپی - انڈیا

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین، و علی آلہ و صحبہ اجمعین.

انگریزی دور حکومت میں اسلام اور تعلیمات اسلام کے خلاف بہت سارے فتنے سامنے آئے، ان فتنوں کی شدت کا یہ حال تھا کہ انھوں نے مسلمانوں میں بھونچال کی صورت پیدا کردی، ان میں ایک بڑا فتنہ منکرینِ حدیث کا تھا، جو بڑی قوت سے یہ پروپیگنڈا کررہے تھے کہ ہماری رہنمائی کے لیے قرآن کافی ہے، حدیث نبوی کی ضرورت نہیں، کیونکہ حدیث کا عظیم الشان ذخیرہ قابلِ اعتماد نہیں ہے، پھر اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئیں اور مسلمانوں میں پھیلائی گئیں، اور کوئی شبہہ نہیں کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو جدید علم سے گو آراستہ تھا، مگر کتاب وسنت کی تعلیم سے قطعاً بے بہرہ تھا، اس گمراہ فرقہ کے دھوکہ میں آنے لگا تھا۔

اس وقت ضرورت محسوس ہوئی کہ منکرینِ حدیث کے غلط پروپگنڈے کی تردید کی جائے اور حجیتِ حدیث پر قلم اٹھایا جائے، اور عام مسلمان خصوصاً اہلِ علم طبقہ کو اس گمراہی سے بچایا جائے، اس نازک موقع پر والدِ محترم امیر الہند محدث کبیر حضرت مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نور اللہ مرقدہ نے ''نصرۃ

الحدیث'' کے نام سے ایک محققانہ کتاب تصنیف فرمائی، جو طبقۂ علماء میں کافی مقبول ہوئی، اس وقت کے سب سے بڑے عالمِ دین حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے پڑھ کر تحریر فرمایا تھا: ''جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا''۔

پہلی دفعہ یہ کتاب (نصرۃ الحدیث) ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی، تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اور منکرینِ حدیث کے پھیلے ہوئے فتنہ پر آہنی دیوار ثابت ہوئی، اور اس کا زور ٹوٹنے لگا، اس وقت اس کے مسلسل دو اڈیشن شائع ہوئے، حدیث کی حجیت اور اہمیت وفضیلت پر بہت موثر ثابت ہوئی، اس کتاب کے مطالعہ سے بہت سارے مسلمانوں نے انکار حدیث نبوی سے توبہ کیا، اور منکرینِ حدیث کی کتابوں سے جو تذبذب اور شکوک وشبہات ان کے دلوں میں پیدا ہو چکے تھے، اس دلدل سے صحت وسلامتی کے ساتھ نکل آئے اور حدیث نبوی کی صحت اور اس کی ضرورت پر ایمان ویقین پختہ ہو گیا۔

اس سے قبل اس کتاب کے تین اڈیشن حسنِ قبول حاصل کر چکے ہیں، اب اس کا یہ چوتھا اڈیشن منظر عام پر آ رہا ہے، کتابت وطباعت کے نئے طریقوں کے مطابق اس کو کمپوز کرا کے تیار کیا گیا ہے، اور اعلیٰ معیار پر صاف ستھرا اور پاکیزہ اڈیشن ہدیۂ ناظرین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی پروف ریڈنگ بھی بہت اہتمام اور توجہ سے کی گئی ہے، اس کے باوجود کتابت وطباعت کی غلطیوں کے رہ جانے کا امکان موجود ہے، جو خاصۂ بشریت ہے، اس کے لیے قارئین سے درخواست ہے کہ ہمیں معذور رکھیں، اور اللہ سے اس کی قبولیت اور زیادہ سے زیادہ افادیت کے لیے دعا فرمائیں۔

پیشِ نظر کتاب کا شمار محدث جلیل حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اہم تصانیف میں ہوتا ہے، چنانچہ عرب اہل علم ۔جن میں سرفہرست مشہور محدث ومحقق شیخ

عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ محمد عوامہ مدظلہ ہیں۔کو جب اس کتاب کا علم ہوا، تو حضرت والد صاحب سے اس کا عربی میں ترجمہ کرانے کے لیے بار بار اصرار کرتے رہے، حضرت والد صاحبؒ اور شیخ ابوغدہؒ کی حیات میں تو یہ کام نہیں ہوسکا، مگر بعد میں اس کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا، اور ڈیڑھ سال پہلے بیروت سے چھپ کر یہ کتاب شائع ہوئی، اس کے عربی اڈیشن پر شیخ محمد عوامہ نے ایک نہایت بیش قیمت اور مبسوط مقدمہ بھی تحریر فرمایا، جس میں اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔

بہرحال حدیث کے دفاع اور منکرینِ حدیث کے رد میں یہ ایک عظیم الشان اور شاہکار تصنیف ہے، جس پر اہلِ علم کا اعتماد ہے، اور ان کے لیے یہ سند کا درجہ رکھتی ہے، علمی حلقوں میں اس کتاب کی جس قدر پذیرائی ہوئی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر دوسری کسی کتاب کو یہ شرف حاصل نہ ہوا ہوگا۔

اللہ سے دعا ہے کہ اس کے مصنف حضرت محدث جلیل علیہ الرحمۃ کو اس کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے، اور اس کے نفع کو عام اور تام فرمائے، آمین یارب العالمین۔

رشید احمد الاعظمی

مدیر

دارالمآثر الاسلامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ طبع ثانی

حامداً ومصلیاً۔

آج سے چھ برس پہلے میں نے مولانا بہاء الحق قاسمی امرتسری کی فرمائش پر منکرینِ حدیث کے رد میں ''نصرۃ الحدیث'' لکھی تھی، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اس نے اس حقیر رسالہ کو بڑی مقبولیت بخشی، چنانچہ اس کا پہلا اڈیشن جو مولانا بہاء الحق موصوف کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، چند ہی دنوں میں ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔

اس وقت سے علم دوست حضرات کا اس کے دوسرے اڈیشن کے لیے سخت تقاضا تھا، مولانا محمد ایوب صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم کو یہ تقاضے زیادہ سننے پڑتے تھے، اس لیے ان کو اس کی اشاعت کی زیادہ فکر تھی، لیکن ان کا خیال تھا کہ اس پر ایک مقدمہ کا اضافہ ہو جائے، جس میں محدثین کے حافظہ وغیرہ پر مبسوط تبصرہ ہو، تو رسالہ کی افادی حیثیت کو چار چاند لگ جائیں، اس لیے وہ کئی سال سے مقدمہ لکھنے کا بہت اصرار سے تقاضا کر رہے تھے، اور اسی انتظار میں رسالہ کو پریس کے حوالہ نہیں کرتے تھے، مجھ کو ان کی اس رائے سے بدیں لحاظ اتفاق تھا کہ اگر مقدمہ لکھنے کی نوبت آئی، تو اس میں بہت سے وہ باتیں بھی پیش کر سکوں گا جن کو اصل رسالہ میں لکھنے کی ضرورت تھی، مگر تطویل کے اندیشہ سے وہاں قصداً نظر انداز کرنی پڑیں۔

باایں ہمہ دوسرے کاموں سے میں اتنی فرصت نہیں پاتا تھا کہ مقدمہ لکھ

سکوں، اب چونکہ فرصت کا انتظار کرتے کرتے کئی سال گزر گئے، اور رسالہ کی دوبارہ اشاعت میں بہت زیادہ تاخیر ہوگئی، اس لیے مجبوراً سرِ دست دوسرے کاموں کو پیچھے ڈال کر مقدمہ لکھنا شروع کر رہا ہوں، واللہ ولی التوفیق۔

فتنہ انکار حدیث

ہندوستان میں انکارِ حدیث کی بدعت بظاہر تو عبداللہ چکڑالوی نے (پنجاب میں) ایجاد کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبداللہ چکڑالوی سے بہت پہلے اس فتنے کا بیج نیچری فرقہ نے بویا تھا، عبداللہ چکڑالوی نے آکر اس شجرۂ ملعونہ کی آبیاری کی اور اسی کے ہاتھوں وہ بڑھا اور پھولا پھلا، اس لیے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس فتنے کا بانی وہی ہے۔

نیز نیچری فرقہ اپنے اس عقیدہ کا صاف لفظوں اور زیادہ گھناونے انداز میں اظہار نہیں کرتا تھا، چکڑالوی نے بے حجاب ہو کر اپنے کفریات کی اشاعت اور حد سے زیادہ ایمان سوز و اسلام کُش پیرایۂ بیان اختیار کیا، اس لیے انکارِ حدیث کی لعنت اسی کی طرف منسوب کی گئی۔

انکار حدیث کا محرک وسبب

بہر حال اس فتنے کا بانی جو بھی ہو، اس کا اصلی محرک تو جیسا کہ میں ''نصرۃ الحدیث'' میں بتا چکا ہوں، لادینی و آزادہ روی ہے، مگر اپنی لادینی پر پردہ ڈالنے اور انکارِ حدیث کے عقیدہ میں زبردستی معقولیت پیدا کرنے کے لیے منکرینِ حدیث کہا اور لکھا کرتے ہیں کہ:

''حدیثیں آنحضرت ﷺ کی وفات کے دو سو برس بعد معرضِ تحریر میں آئی ہیں''۔ (دیکھو عظیم بیگ چغتائی کا رسالہ تفویض)

چغتائی کا منشا یہ ہے کہ جب دو سو برس تک حدیثیں لکھی نہیں گئیں، صرف یاد داشت اور زبانی روایت پر دار و مدار رہا، تو اس طویل مدت میں یادداشت کی کمزوری

اور نقل در نقل کی وجہ سے حدیثوں کے الفاظ اور ان کے مضامین و معانی کیا سے کیا ہو گئے ہوں گے، اس حالت میں حدیثوں پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے"۔

چغتائی صاحب کا یہ تخیل اپنی جگہ پر چاہے کتنا ہی غلط اور بے بنیاد ہو، تاہم غنیمت ہے کہ وہ سرے سے حدیثوں کا انکار نہیں کرتے، لیکن "حق گو" جو "نصرۃ الحدیث" میں ہمارے اصلی مخاطب ہیں، ان کی "اپج" تو یہ ہے کہ:

"یقینی بات ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے سے قبل تک لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے"۔

یعنی "حق گو" کے خیال فاسد میں آنحضرت ﷺ کا کوئی قول و فعل صحابہؓ نے کسی سے بیان ہی نہیں کیا، اور حدیثوں کا سرے سے کہیں وجود ہی نہ تھا، وہ تو عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں اور ان کے بعد لوگوں نے اپنی طرف سے حدیثیں بنالیں۔

"حق گو" کے اس تخیل فاسد کا رد تو میں "نصرۃ الحدیث" صفحہ ۷۱ تا ۷۹ اور صفحہ ۲۰۱ اور صفحہ ۲۰۸ تا صفحہ ۲۰۹ میں نہایت وضاحت سے اتنے زوردار طریقے پر کر چکا ہوں کہ کسی منصف مزاج کے لیے مجال گفتگو باقی نہیں رکھی ہے۔

رہا چغتائی صاحب کا تخیل تو اس کا غلط اور بے سروپا ہونا واضح ہے، اور "نصرۃ الحدیث" میں جگہ جگہ اس کا غلط ہونا بھی ثابت کیا جا چکا ہے، نیز جریدہ "ضیاء الاسلام" (امرتسر) جلد اول نمبر ۱۴ میں اس مقالے کے سلسلے میں جو میرے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوا ہے، اس پر کافی بحث ہو چکی ہے، بایں ہمہ اس پر کچھ شرح و بسط سے کلام کرنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ عربی سے ناواقف اور بالخصوص تاریخِ حدیث سے نابلد طبقہ عموماً اس غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

چغتائی صاحب نے مذکورہ بالا تخیل میں گویا دو دعویٰ کیے ہیں:

۱:- آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دو سو برس تک حدیثوں کا قید کتابت

میں نہ آنا۔

۲:-صرف یادداشت پر دارومدار رہنے کی وجہ سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہو جانا۔

اب آیئے ہم ان کے دونوں دعووں کو پرکھیں اور دیکھیں کہ ان میں کتنی صداقت ہے۔

کتابت حدیث کی تاریخ

چغتائی صاحب کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد دوسو برس تک حدیثیں صرف زبانی رہیں، لیکن جب ہم تاریخ و سیر کا مطالعہ کرتے ہیں، بلکہ تاریخ سے بھی زیادہ مستند بیانات پڑھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی کتابت آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکی تھی۔

عہدِ نبوی میں حدیث کی کتابت | چنانچہ صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۲۲ میں حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ صحابہؓ میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے سوا کسی اور کے پاس مجھ سے زیادہ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں نہیں ہیں، حضرت عبداللہ کے پاس اتنی زیادہ حدیثیں اس وجہ سے ہیں کہ وہ لکھا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا (مسند احمد اور طحاوی صفحہ ۳۸۴ جلد ۲)۔

اور مجمع الزوائد (۱۵۱/۱) میں حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور دل میں یاد بھی کرتے تھے، اور میں صرف دل سے یاد کرتا تھا، لکھتا نہ تھا، انھوں نے آنحضرت ﷺ سے لکھنے کی اجازت لی تھی، اور آنحضرت ﷺ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔

مجمع الزوائد (۱۵۱/۱) میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ علم کو مقید کرو، حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ علم کا مقید کرنا کیا ہے؟ تو حضرتؐ نے فرمایا کہ لکھنا۔

سنن ابوداود (۷۷/۲) اور دارمی (ص ۶۸) میں خود حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ میں جتنی باتیں (۱) آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنتا تھا یاد

---

(۱) فقرہ کنت اکتب کل شیء الخ (یعنی میں ہر بات جو آنحضرت ﷺ سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا) خاص طور پر قابل توجہ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام حدیثیں لکھتے تھے ۱۲ منہ۔

رکھنے کے لیے ان کو قلم بند کر لیتا تھا، قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا کہ آنحضرت ﷺ بشر ہیں، اور بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں بھی فرما جاتے ہوں گے، اس لیے حدیثیں نہ لکھو، میں ان کے کہنے سے رک گیا، اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تم لکھو اور اپنے دہانِ مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے کسی حالت میں ناحق اور غلط بات نہیں نکلتی۔

ان بیانات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں آپ کی تمام حدیثیں آپ کے حکم واجازت سے لکھتے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہؓ نے کتابتِ حدیث کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس کو انھوں نے برابر جاری رکھا، تا آنکہ ان کے پاس احادیث کا ایک دفتر تیار ہو گیا تھا، اور اس کا نام انھوں نے ''صادقہ'' رکھا تھا۔ اس دفترِ احادیث سے ان کو ایسا عشق تھا کہ کسی حالت میں بھی اس کی مفارقت ان کو گوارا نہ تھی، فرماتے تھے: **ما یرغبني في الحیاۃ الا الصادقة** یعنی مجھ کو زندگی کا خواہش مند یہی کتاب (صادقہ) بنا رہی ہے، یہ نہ ہو تو مجھے جینے کی خواہش نہیں ہے۔ پھر خود ہی صادقہ کا تعارف ان الفاظ میں کراتے تھے: **فأما الصادقة فصحیفة کتبتها من رسول الله ﷺ** (یعنی صادقہ ایک صحیفہ (دفتر) ہے، جس کو میں نے آنحضرت ﷺ سن سن کر لکھا ہے (دارمی ص ٦٨)۔

یہ دفتر کتنا ضخیم ہو گا؟ اور اس میں کتنی زیادہ حدیثیں ہوں گی، اس کا اندازہ لگانے کے لیے حضرت عبداللہ کا یہ بیان کافی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک ہزار (صرف) امثال یاد کیے ہیں (عینی ۱/۱۸)

تہذیب التہذیب (۴۸/۵) میں ابن معین کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی چند کتابیں ان کے پوتے شعیب کو ملی تھیں، شعیب ان میں کی حدیثوں کی روایت کیا کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث کی کتابوں میں **عمرو بن شعیب**

عن ابیہ عن جدہ کے سلسلے سے جتنی حدیثیں مذکور ہیں، وہ سب حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے اسی صحیفے کی حدیثیں ہیں، جیسا کہ تہذیب التہذیب (ترجمہ عمرو) میں متعدد محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا یہ صحیفہ شعیب کے بعد ان کے بیٹے عمرو کے ہاتھ لگا تھا، اور وہ اس کو اپنے باپ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں۔

عہدِ نبوی میں متعدد صحابہؓ کا حدیث لکھنا یہ خیال بھی نہ کرنا چاہئے کہ عہد نبوی میں تنہا حضرت عبداللہ بن عمروؓ حدیثیں لکھتے تھے، اس لیے کہ سنن دارمی (ص ۶۸) میں خود ان ہی کا بیان ہے کہ ایک دن ہم آنحضرت ﷺ کے گرد بیٹھے ہوئے حدیثیں لکھ رہے تھے، اسی اثناء میں کسی نے پوچھا کہ قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا یا رومہ، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا۔ اس روایت میں بینما نحن حول رسول اللہ (ﷺ) نکتب کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ ان کے ساتھ ایک جماعت لکھ رہی تھی، حضرت عبداللہؓ ہی کے ایک دوسرے بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب انھوں نے حدیث لکھنا شروع نہیں کیا تھا، اس وقت بھی کئی صحابیؓ لکھا کرتے تھے، ان کا وہ بیان مجمع الزوائد (۱۵۲/۲) میں یوں منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں چند صحابی بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ان کے ساتھ حاضر تھا، آنحضرت ﷺ نے اس وقت ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔ جب ہم وہاں سے اٹھے تو میں نے ان صحابیوں سے کہا کہ یہ وعید سننے کے بعد آپ لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کرنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ تو ان صحابہ نے فرمایا کہ بھتیجے! ہم نے آنحضرت ﷺ سے جو کچھ سنا ہے وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح دوسرے مستند بیانات سے بھی متعدد صحابہ کا حدیثیں لکھتے رہنا

ثابت ہے، چنانچہ مجمع الزوائد (۱/۱۵۱) میں بحوالہ طبرانی حضرت رافع بن خدیج (صحابی) کا بیان مذکور ہے کہ ہم نے خدمتِ نبوی میں یہ گزارش کی کہ: یا رسول اللہ! اِنَّا نَسمعُ مِنکَ أشیاءَ فَنکتُبُها، قال: اُکتُبوا و لا حَرَجَ، یعنی یارسول اللہ ہم آپ کی زبان سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں اور اس کو لکھ لیتے ہیں، تو اس کی نسبت کیا حکم ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لکھتے رہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت رافعؓ کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ متعدد اشخاص کا دستور تھا کہ حدیثیں سن کر لکھ لیتے تھے۔

ترمذی (۲/۹۱) اور مجمع الزوائد (۱/۱۵۲) میں حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک انصاری صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی کہ مجھ کو حدیثیں یاد نہیں رہتیں، تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو، یعنی لکھ لیا کرو۔

مجمع الزوائد (۱/۱۵۲) میں حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حدیثوں کے یاد نہ رہنے کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے مدد لو۔

کنز العمال (۵/۲۲۶) میں حضرت ابن عباسؓ و حضرت جابرؓ سے بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے کام لینے (یعنی لکھنے) کا حکم دیا۔

عہد نبوی کی کتاب الصدقہ ابوداود (۱/۱۵۶) اور ترمذی (۱/۷۹) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لیے ایک کتاب الصدقہ لکھوائی تھی جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق حدیثیں تھیں، لیکن ابھی اس کو عاملوں کے پاس بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی، کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کا سانحہ پیش آگیا، جب حضرت ابوبکرؓ آپ کے جانشیں ہوئے تو انھوں نے اس پر عمل کیا۔

عہدِ نبوی کا ایک اور نوشتہ ترمذی (۱/۳۰۶) اور نسائی (۲/۱۹۱) میں عبداللہ بن عکیم کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں آپ کا ایک نوشتۂ مبارک ہمارے (قبیلہ جہینہ کے) پاس پہونچا، جس میں یہ حدیث تھی کہ مردار جانور کی (بے پکائی ہوئی) کھال اور پٹھے کو کام میں نہ لاؤ۔

فتح مکہ کا خطبہ صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتحِ مکہ کے دن ایک طویل خطبہ دیا، جس میں بہت سی حدیثیں ارشاد فرمائیں، جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوشاہ یمنیؓ نے درخواست کی کہ میرے لیے یہ خطبہ لکھوا دیا جائے، حضرتؐ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور حکم دیا کہ ان کو خطبہ لکھ کر دے دیا جائے۔

کتاب عمرو بن حزمؓ طحاوی (۲/۴۱۷) اور نسائی وغیرہما میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک نوشتہ لکھوا کر عمرو بن حزم کے ہاتھ اہلِ یمن کے پاس بھیجا تھا، اس نوشتہ میں فرائض وسنن اور خون بہا کے مسائل تھے، اس نوشتہ کے جستہ جستہ فقرے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، مستدرک حاکم (جلد ۱ ۳۹۵ لغایت ص ۳۹۷) میں اس نوشتہ سے تریسٹھ حدیثیں نقل کی ہیں۔ اہلِ یمن کے نام ایک نوشتہ کا ذکر امام شعبی نے بھی کیا ہے، اور اس نوشتہ کی کئی حدیثیں امام شعبی کی روایت سے مصنف ابن ابی شیبہ (ص ۱۰ از کوٰۃ وص ۱۲ از کوٰۃ) میں منقول ہیں۔

صحیفۂ حضرت علیؓ عہدِ نبوی کے نوشتوں میں سے ایک حضرت علیؓ کا صحیفہ بھی تھا، جس میں خود حضرت علیؓ کے بیان کے مطابق خون بہا اور اسیروں کی رہائی کے مسائل تھے۔ اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ کوئی مسلمان کافر (حربی) کے بدلہ میں نہ مارا جائے (بخاری ۱/۲۱)، اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مدینہ کی سرزمین عیر سے ثور تک حرم (بہت زیادہ قابلِ احترام) ہے، لہٰذا جو شخص اس میں کوئی بدعت نکالے، یا

کسی بدعتی کو پناہ دے اس پر تمام انسانوں اور فرشتوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس کی کوئی فرض یا نفل عبادت قبول نہ کرے گا (بخاری ۱/۲۵۱ و مسلم ص)، اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ جو شخص غیر خدا کے لیے جانور ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت، اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو اپنے باپ پر لعنت کرے، اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو کسی بدعتی کو پناہ دے، اور اُس پر اللہ کی لعنت جو زمین کا نشان مٹائے (مسلم ۲/۱۶۱)۔

اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ سب مسلمانوں کا خون برابر ہے، اور یہ کہ ایک معمولی مسلمان نے ذمہ لے لیا تو اس کا پاس ولحاظ سب مسلمانوں پر ضروری ہے، اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا ذمہ توڑے گا، تو اس پر خدا اور سارے فرشتوں اور انسانوں کی لعنت، اور یہ بھی تھا کہ جو شخص اپنے مولیٰ کے سوا دوسرے کو مولیٰ بنائے اس پر بھی سب کی لعنت (بخاری ۱/۲۵۱)۔

اور اس میں زکوٰۃ کے مسائل بھی تھے (بخاری ۱/۴۳۸ نیز مسند احمد وطحاوی ۲/۳۰۴)۔

عہدِ نبوی میں کتابتِ حدیث کے یہ چند واقعات سرسری طور پر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں، تلاش وجستجو کرنے والے کو اور واقعات بھی مل سکتے ہیں۔

عہدِ صحابہ میں حدیث کی کتابت

اس کے بعد عہدِ صحابہ کی تاریخ پڑھیے، اس عہد میں بھی آپ کو کتابتِ حدیث کے بے شمار واقعات ملیں گے، تمثیل کے طور پر چند واقعات اس عہد کے بھی نقل کیے جاتے ہیں۔

۱- اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ سنئے! مؤرخ اسلام حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (ص ۵) میں اور شیخ علی متقی نے کنز العمال (۲۳۷/۵) میں امام حاکم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت ﷺ کی حدیثیں جمع کرنا شروع کی تھیں، پانچ سو حدیثیں لکھ چکے تھے کہ ایک دن اس مجموعہ کو منگا کر آگ میں ڈال دیا، اور فرمایا کہ: ''اس میں میں نے وہ حدیثیں بھی لکھی تھیں، جن کو براہِ راست آنحضرت ﷺ سے میں نے نہیں سنا تھا، بلکہ کسی اور کی زبانی سنا تھا، ممکن ہے کہ اس نے مجھ سے جس طرح بیان کیا ہے، اس طرح آنحضرت ﷺ نے نہ فرمایا ہو، کسی اور طرح فرمایا ہو، تو خواہ مخواہ میری گردن پر اس کا بوجھ ہوگا''۔

۲- دارمی (ص ۶۸) و مستدرک حاکم (۱۰۶/۱) میں امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ کا یہ فرمان منقول ہے کہ علم کو کتاب میں مقید کرلو۔

۳- دارمی و مستدرک میں حضرت انسؓ سے بھی مروی ہے کہ علم کو لکھ کر مقید کرو۔ نیز صحیح مسلم (۴۶/۱) میں ہے کہ حضرت انسؓ نے محمود بن الربیعؓ (صحابی) کی زبانی حضرت عتبانؓ کی ایک طویل حدیث سنی، تو اپنے لڑکے سے کہا کہ اس کو لکھ لو، چنانچہ انھوں نے لکھ لیا۔ طحاوی (۳۸۴/۲) میں بھی حضرت انسؓ کا اپنے لڑکے سے حدیث لکھوانا مذکور ہے۔

۴- حضرت ابو ہریرہؓ (۱) کی نسبت اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ عہدِ نبوی میں حدیثوں کو لکھا نہ کرتے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر یا کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنی حدیثوں کو سفینہ میں محفوظ کر لیا تھا، چنانچہ فتح الباری (۱/۱۴۸) میں حسن بن عمرو کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے، اور حدیثِ نبوی کی کئی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں۔

اور بشیر بن نہیک کا بیان طحاوی (۲/۳۸۵) میں ہے کہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث کی کتابیں عاریت لے کر نقل کرتا تھا، نقل سے فارغ ہو کر ان کو خود سناتا جاتا تھا، سنانے کے بعد عرض کرتا تھا کہ میں نے آپ کو جو سنایا ہے، وہ سب آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ ہاں۔

۵- حضرت ابن عباسؓ (۲) کے بھی چند صحیفے تھے، جن میں حدیثیں قلمبند تھیں، چنانچہ ترمذی (۲/۲۳۸) اور طحاوی (۲/۳۸۴) میں ہے کہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابن عباسؓ کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ہم کو یہ سنا دیں، اس وقت حضرت ابن عباسؓ کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی تھی، اس لیے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا: تم خود سنا دو، تمھارا سنانا اور میرا پڑھنا جوازِ روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں۔

۶- ابوداود (۲/۱۸) میں ابوالبختری کا بیان ہے کہ میں نے ایک صحابی یا تابعی سے حدیث سنی اور مجھ کو بہت بھلی معلوم ہوئی، تو میں نے ان سے درخواست کی کہ اس کو میرے لیے لکھ دیجیے، چنانچہ انھوں نے لکھ کر میرے حوالہ کیا۔

۷- دارمی (ص ۶۸) میں ہے کہ ابان (تابعی) حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے ہوئے ساگون کی تختیوں پر حدیثیں لکھتے رہتے تھے۔

---

(۱) المتوفی ۵۸ھ ۱۲ (۲) المتوفی ۶۸ھ ۱۲

۸- طحاوی (۳۸۴/۲) میں عبداللہ بن محمد بن عقیل کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابر(۱) کی خدمت میں حاضر ہو کر آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو پوچھتے تھے اور لکھ لیتے تھے۔

۹- دارمی (ص ۶۹) میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ (۲) نے فرمایا کہ علم کو قید تحریر میں لاؤ، چنانچہ دارمی ہی میں حضرت سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ سے حدیثیں سنتا تھا تو لکھ لیتا تھا۔

۱۰- دارمی (ص ۶۹) اور طحاوی (۳۸۴/۲) میں ہے کہ حضرت سعید بن جبیر وغیرہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس حدیثیں لکھتے رہتے تھے، بلکہ دارمی میں یہ بھی ہے کہ کاغذ بھر جاتا تھا، تو کسی دوسری ہی چیز پر لکھ لیتے تھے۔

۱۱- دارمی (ص ۶۹) میں ہے کہ عنترہ کو بھی حضرت ابن عباسؓ نے حدیث لکھنے کی اجازت دی۔

۱۲- دارمی (ص ۶۹) میں عبداللہ بن حنش کا بیان ہے کہ میں نے حضرت براءؓ (۳) کی مجلس میں لوگوں کو ہتھیلیوں پر بھی حدیث لکھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ناچیز کہتا ہے کہ کاغذ بھر جاتا ہوگا تو ہتھیلیوں پر اس لیے لکھ لیتے ہوں گے کہ گھر پہونچ کر کاغذ پر نقل کرلیں گے۔

۱۳- دارمی میں ہے کہ حسن بن جابر نے حضرت ابوامامہ باہلیؓ (۴) سے حدیث لکھنے کی بابت دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

۱۴- مجمع الزوائد (۱۵۱/۱) میں ابوبردہ اشعری کا بیان مذکور ہے کہ میں اپنے والد (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) سے حدیثیں سنتا تھا، تو لکھ لیا کرتا تھا، ایک دن میرے والد نے میرا مجموعہ منگوا کر مجھ سے پڑھوایا، میں پڑھ چکا تو فرمایا کہ ہاں میں نے آنحضرت ﷺ سے اسی طرح سنا ہے، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کمی بیشی نہ ہو جائے۔

---

(۱) متوفی ۷۸ھ ۱۲- (۲) المتوفی ۷۴ھ ۱۲- (۳) المتوفی ۷۲ھ ۱۲- (۴) المتوفی ۸۶ھ ۱۲-

عہدِ تابعین میں کتابتِ حدیث

اوپر جو واقعات آپ نے پڑھے ہیں، ان میں صحابہ کے سامنے یا صحابہؓ سے سن کر حدیث لکھنے کا ذکر ہے، اب چند ایسے واقعات سنئے، جن میں تابعین کے سامنے یا تابعین سے سن کر، حدیث لکھنے کا تذکرہ ہے۔

۱- ترمذی (۲۳۸/۲) اور دارمی (ص ٦٦) میں ابراہیم نخعی کا بیان ہے کہ سالم بن ابی الجعد حدیثیں لکھا کرتے تھے، سالم کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے، اور انھوں نے بعض صحابہؓ سے بھی حدیثیں سنی ہیں۔

۲- تذکرۃ الحفاظ (۱۰۳/۱) میں ابوالزناد (تابعی) کا بیان ہے کہ ہم زہری کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سننے کے لیے جاتے تھے، زہری اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لیے رہتے تھے، اور جتنا سنتے تھے سب لکھتے رہتے تھے۔ زہری کی وفات ۱۲۴ھ میں ہوئی ہے۔

۳- کنز العمال (۲۳۸/۵) میں صالح بن کیسان (تابعی) کا بیان ہے کہ طلبِ علم کے زمانہ میں میرا اور زہری کا ساتھ تھا، زہری نے مجھ سے کہا آؤ آنحضرت ﷺ کی حدیثیں لکھیں، چنانچہ ہم دونوں نے حدیثیں لکھیں۔

۴- دارمی (ص ٦٩) میں ہشام بن الغاز کا بیان منقول ہے کہ عطاء بن ابی رباح (تابعی) سے لوگ پوچھتے جاتے تھے اور انھیں کے سامنے لکھتے جاتے تھے۔ عطاء بن ابی رباح کی وفات ۱۱۴ھ میں ہوئی۔

۵- دارمی (ص ٦٩) میں رجاء بن حیوۃ (المتوفی ۱۱۲ھ) کا بیان ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے اپنے عامل کو مجھ سے ایک حدیث دریافت کرنے کے لیے لکھا، اگر وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی نہ ہوتی، تو میں اس کو بھول ہی چکا تھا۔

۶- دارمی (ص ۶۹) میں سلیمان بن موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے نافع (تابعی) کو دیکھا ہے کہ وہ حدیثیں اپنی زبان سے بولتے جاتے ہیں اور لوگ ان کے سامنے لکھتے جاتے ہیں۔ نافع کا انتقال ۱۱۷ھ میں ہوا۔

۷- ترمذی (۲/۲۳۹) میں ہے کہ ایک شخص حسن بصری کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، میں ان کی روایت آپ سے کرسکتا ہوں؟ تو انھوں نے کہا ہاں۔ تہذیب التہذیب (۳/۳۹) میں ہے کہ حمید طویل نے حسن بصری کی کتابیں نقل کی تھیں۔ حسن بصری کی وفات ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

۸- ترمذی (۲/۲۳۹) میں ابن جریج کا بیان ہے کہ میں ہشام بن عروہ کے پاس ایک کتاب لے کر پہونچا اور کہا: یہ آپ کی روایتیں ہیں، ان کو میں بیان کروں؟ تو انھوں نے کہا: ہاں۔ ہشام بن عروہ کی وفات ۱۴۶ھ میں ہوئی۔

۹- تذکرۃ الحفاظ (۱/۸۸) میں ہے کہ ابوقلابہ وفات کے وقت اپنی کتابوں کی وصیت ایوب سختیانی کے لیے کر گئے تھے، چنانچہ وہ کتابیں شام سے اونٹ پر بار کر کے لائی گئیں۔ ایوب فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ چودہ درہم ان کا کرایہ ادا کیا۔ ابوقلابہ کی وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی۔

۱۰- صحیح بخاری (۱/۱) فتح الباری (۱/۱۴۰) اسعاف المبطا (ص ۵) دارمی (ص ۶۸) میں ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام اطرافِ سلطنت میں یہ فرمان بھیجا، کہ آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو جمع کرو، چنانچہ ابوبکر بن حزم (جو ان کی طرف سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس جب یہ فرمان پہونچا تو انھوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کیے، مگر ابھی ان کو دربارِ خلافت میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات ہوگئی، نیز عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ابن شہاب زہری نے بھی حدیثوں کو مدوّن کیا تھا، تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۰۶) میں معمر کے بیان سے

معلوم ہوتا ہے کہ زہری کی حدیثوں کے دفتر کئی اونٹوں پر بار کیے گئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے۔

عہدِ تابعین کے یہ چند واقعات برسبیلِ تذکرہ میں نے پیش کیے ہیں، اور ہر واقعہ کے ساتھ صاحبِ واقعہ کا سن وفات بھی لکھ دیا ہے، سنینِ وفات دیکھ کر آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ واقعہ وفات نبویؐ سے صرف سو برس بعد کے ہیں، بلکہ اکثر تو سو برس کے اندر ہی کے ہیں۔

تبع تابعین کے عہد میں حدیث کی کتابت

اب ذرا اور قریب آیئے اور تبع تابعین کا دور نظر کے سامنے رکھیے تو اور زیادہ کتابتِ احادیث کے واقعات آپ کی نگاہ سے گزریں گے، اور حدیثوں کے دفتر آپ کو دکھائی دیں گے، جو اس عہد میں لکھے گئے، اور ان میں سے بعض بعض آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں، اس دور میں حدیثوں کے لکھنے کا یہ دستور تو باقی ہی تھا، کہ استاذ سے جو حدیثیں سنیں، لکھ لیں، چنانچہ محمد بن بشر کا بیان ہے کہ مسعر (المتوفی ۱۵۵ھ) کے پاس ایک ہزار حدیثیں تھیں، میں نے دس کے سوا ساری لکھ لیں (تذکرہ ۱۷۷)

عبدالرزاق کا بیان ہے کہ میں نے معمر (المتوفی ۱۵۳ھ) سے دس ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں (تذکرہ ۱/۱۷۵)

حماد بن سلمہ کے پاس قیس بن سعد کی کتاب تھی (تذکرہ ۱/۱۹۸)

ثوری یمن گئے تو ان کو ایک تیز لکھنے والے کاتب کی ضرورت ہوئی، ہشام بن یوسف کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ کو پیش کیا، چنانچہ میں ان کے لیے حدیثیں لکھا کرتا تھا (تذکرہ ۱/۳۱۶)

ابونعیم کا بیان ہے کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔

شعیب ابن حمزہ نے بہت زیادہ حدیثیں لکھی تھیں، زہری بولتے اور شعیب لکھتے تھے۔ امام احمد نے شعیب کی کتابیں دیکھی تھیں، ان کا بیان ہے کہ شعیب کی کتابیں بہت صحیح اور درست تھیں۔ شعیب کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی (تذکرہ ۱/۲۱۰)

ابوعوانہ پڑھنا جانتے تھے، لکھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے جب حدیث سننے کے لیے جاتے، تو دوسرے سے لکھواتے تھے۔ ابوعوانہ کی وفات ۱۶۳ھ میں ہوئی (تذکرہ ۱/۲۱۹)۔

ابن لہیعہ کے پاس بھی حدیث کی کتابیں تھی، چنانچہ ابن صالح کا بیان ہے کہ میں نے عمارہ بن غزیہ کی حدیثیں ابن لہیعہ ہی کی اصل سے نقل کی ہیں۔ ابن لہیعہ نے ۱۷۴ھ میں انتقال کیا (تذکرہ ۱/۲۲۰)۔

سلیمان بن بلال (المتوفی ۱۷۲ھ) کے مسموعات کی بھی کئی کتابیں تھیں، اور اپنے مرنے کے وقت وصیت کر گئے تھے کہ وہ کتابیں عبدالعزیز بن حازم کو دی جائیں (تذکرہ ۱/۲۴۷)۔

ابوحاتم رازی کا بیان ہے کہ ابونعیم نے عبدالسلام بن حرب سے کئی ہزار حدیثیں سن کر لکھیں۔ عبدالسلام کی وفات ۱۸۷ھ میں ہوئی (تذکرہ ۱/۲۴۹)۔

ابن المبارک نے اپنی لکھی ہوئی جن حدیثوں کی روایت کی اور لوگوں کو سنایا، ان کی تعداد بیس ہزار تھی (تذکرہ ۱/۲۵۴)۔

غندر کے پاس بھی ان کی مسموعات کی کتابیں تھی، ابن معین کا بیان ہے کہ ان کی کتابیں سب سے زیادہ صحیح تھیں۔

ابن مہدی کا بیان ہے کہ ہم شعبہ کی زندگی ہی میں غندر کی کتابوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ غندر کی وفات ۱۹۳ھ میں ہوئی (تذکرہ ۱/۱۷۷)۔

بہر حال کتابتِ حدیث کے اس دستور کے علاوہ باقاعدہ تصنیف کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا، چنانچہ مکہ معظمہ میں ابن جریج (المتوفی ۱۵۰ھ) نے، یمن میں معمر بن راشد (المتوفی ۱۵۳ھ) نے، بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ (المتوفی ۱۵۲ھ) اور ربیع بن صبیح (المتوفی ۱۶۱ھ) نے حدیث کی کتابیں تصنیف کیں، اور اسی عہد میں موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ) اور ابن اسحاق (المتوفی ۱۵۱ھ) نے غزوات و سیرت نبوی پر کتابیں لکھیں۔

اور ان کے بعد امام اوزاعی (المتوفی ۱۵۷ھ) نے شام میں، امام ابن

المبارک (المتوفی ۱۸۱ھ) نے خراسان میں، حماد بن سلمہ (المتوفی ۱۶۷ھ) نے بصرہ میں، سفیان ثوری (المتوفی ۱۶۱ھ) نے کوفہ میں، جریر بن عبدالحمید (المتوفی ۱۸۸ھ) نے رے میں، اور ہشیم (المتوفی ۱۸۳ھ) نے واسط میں حدیث کی کتابیں لکھیں۔

اور تقریباً اسی زمانہ میں امام مالک نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب موطا تصنیف فرمائی، امام مالک نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

اسی زمانہ میں ابومعشر سندی نے غزواتِ نبوی پر کتاب لکھی۔ ابومعشر نے ۱۷۰ھ میں وفات پائی۔

ان حضرات کے بعد ابراہیم بن محمد اسلمی استاذ شافعی نے امام مالک کی موطا کے طرز پر اپنی موطا لکھی، جس کی نسبت ابن عدی کا بیان ہے کہ موطائے مالک سے وہ چند گونہ بڑی تھی۔ ابراہیم کی وفات ۱۸۴ھ میں ہوئی ہے (تذکرہ)۔

یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ کوفی شاگرد امام اعظم بھی صاحبِ تصنیف تھے۔ یحیی کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا (تذکرہ ۲۴۶/۱)۔

معافیٰ بن عمران موصلی (المتوفی ۱۸۵ھ) نے کتاب السنن، کتاب الزہد، کتاب الادب، کتاب الفتن وغیرہ تصنیف کی (تذکرہ ۲۶۵/۱)۔

عبدالرحیم بن سلیمان کنانی نے بھی کئی کتابیں لکھیں (تہذیب ۳۰۶/۶)۔

امام ابو یوسف (المتوفی ۱۸۲ھ) نے کتاب الآثار، کتاب الخراج وغیرہ لکھیں۔ اور امام محمد (المتوفی ۱۸۹ھ) نے موطا، کتاب الآثار، کتاب الحجج وغیرہ تصنیف فرمائیں۔ ولید بن مسلم (المتوفی ۱۹۵ھ) نے حدیث کے مختلف ابواب و موضوعات پر ستر کتابیں لکھیں (تذکرہ ۲۷۹/۱)۔

امام وکیع بھی فن حدیث میں صاحبِ تصنیفات تھے۔ ۱۹۷ھ میں ان کی وفات ہوئی (تذکرہ ۲۸۳/۱)۔

ابن وہب (المتوفی ۱۹۷ھ) نے احوال القیامۃ اور جامع وغیرہ تصنیف کیں، نیز ایک بہت ضخیم موطا بھی ان کی تصنیفات میں ہے۔

محمد بن فضیل (المتوفی ۱۹۵ھ) نے کتاب الزہد، کتاب الدعاء وغیرہ اپنی یادگار چھوڑی۔

اس دور کی تصنیفات میں سے سفیان کی جامع، ابن المبارک کی کتاب الزہد والرقاق، امام مالک کی موطا، ابویوسف کی کتاب الآثار، اور کتاب الخراج اور امام محمد کی موطا، کتاب الآثار اور کتاب الحجج وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

چغتائی کا دوسرا دعویٰ

چغتائی کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ:

''دو سو برس تک صرف زبانی روایت پر دار و مدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہو گئیں''۔

اگرچہ پہلے دعویٰ کا غلط اور بے سروپا ہونا ثابت کر دینے کے بعد اس دوسرے دعویٰ پر کچھ لکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لیے کہ یہ دعویٰ تمام تر پہلے ہی دعویٰ پر مبنی ہے، اور اس کا غلط ہونا ثابت ہو چکا، تو اب اس کے غلط ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے، تاہم تبرعاً اس پر کلام کرتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ اگرچہ اوپر تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکا ہے کہ صرف زبانی روایت پر کسی زمانے میں بھی دار و مدار نہیں رہا ہے، بلکہ عہدِ نبوی ہی سے کتابتِ حدیث کا سلسلہ برابر جاری رہا ہے، لیکن اگر بالفرض یہ سلسلہ نہ رہا ہوتا تو بھی عہدِ نبوی سے لے کر پچھلے ہر دور میں حدیثوں کو سینے میں محفوظ رہنے کا جو بلیغ اہتمام تھا، اور اس کے اداو بیان کرنے میں جو کامل احتیاط مدنظر تھا، اس کے پیش نظر یہ دعویٰ کرنا ممکن ہی نہیں، کہ ''زبانی روایت پر دار و مدار رہنے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہو گئیں''۔

حفظِ حدیث کا اہتمام بلیغ

عہدِ نبویﷺ عہدِ نبوی میں حدیثوں کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ اہتمام تھا کہ صحابہؓ حدیثوں کا دور کیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے حدیثیں سنتے رہتے تھے، جب آپ مجلس سے اٹھ جاتے، تو ہم آپس میں حدیثوں کا ''دور'' کرتے تھے، ایک دفعہ ایک آدمی کُل حدیثیں بیان کر جاتا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، بسا اوقات ساٹھ ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے، اور وہ ساٹھوں باری

باری سے بیان کرتے تھے، اس کے بعد جب ہم اٹھتے تھے، تو حدیثیں اس طرح ذہن نشیں ہوتی تھیں کہ گویا ہمارے دلوں میں بو دی گئی ہیں۔ (مجمع الزوائد ۱/۱۶۱)

حضرت معاویہؓ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں فرض نمازوں کے بعد مسجد میں صحابۂ کرامؓ بیٹھ جاتے، اور قرآن پاک اور احادیث نبویہ کا مذاکرہ کرتے تھے۔ (مستدرک ۱/۹۴)

حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ صحابۂ کرامؓ جب کہیں بیٹھتے تھے، تو ان کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی آنحضرت ﷺ کی حدیثیں ہوتی تھیں، یا پھر یہ کہ کوئی قرآن پاک کی کوئی سورۃ پڑھے یا کسی سے پڑھنے کو کہے۔ (مستدرک ۹۴)

دور کرنے کے علاوہ انفرادی طور پر بھی حدیثوں کو ازبر کرنے کا بڑا اہتمام تھا، اور جن کو باوجود کوشش کرنے کے حدیثیں یاد نہ ہوتی تھیں، وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کرتے تھے، اور پوچھتے تھے کہ حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کریں، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ کے بیان سے اوپر (زیرِ عنوان ''عہدِ نبوی میں حدیث کی کتابت'') معلوم ہو چکا ہے، نیز حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ بیان بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ میں حدیثوں کو صرف دل سے یاد کرتا تھا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان مسلم (۱/۱۰) ابن ماجہ صفحہ (ص ۴) وغیرہ میں ہے:

کنا نحفظ الحدیث (یعنی) ہم حدیثیں یاد کیا کرتے تھے

اس قسم کے مزید واقعات نقل کر کے بات کو طول دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، صرف ایک بات لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کا صحابہ کو نہایت تاکیدی حکم تھا کہ ''جو لوگ میری مجلس میں حاضر ہوں وہ غیر حاضروں کو میری حدیثیں ضرور پہنچا دیں''۔ (بخاری ۱/۱۶) [1]

[1] بعض دوسری روایتوں میں حدیثوں کے روایت کرنے والوں کو اپنا جانشین فرمایا ہے، دیکھو کنز العمال (۵/۲۲۲)، ایک دوسری حدیث میں اس شخص کو جنت کی بشارت دی ہے جو امت کے لیے چالیس حدیثیں محفوظ کر لے، ۱۲ منہ

نیز ان لوگوں کے حق میں تروتازگی وسرسبزی کی دعا فرمائی تھی جو آپؐ کی حدیثوں کو سن کرخوب اچھی طرح یاد کرلیں، اور پھراس کو بجنسہ دوسروں تک پہنچادیں۔

نضّر اللهُ عبداً سَمِعَ مقالتي (و في روايةٍ) حديثنا (كما في الدارمي ص ۴۲) فَحَفِظَها و وعاها و أدّاها (و في روايةٍ) فَبَلّغَه (دارمی ۴۲) كما سمعَ (مشکوٰۃ ص ۲۷ بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ، دارمی) اللہ تعالیٰ اس بندہ کو سرسبز (خوش) رکھے جو میری کوئی حدیث سن کر یاد کرلے اور خوب سمجھ لے، پھراس کو جس طرح سنا ہے اسی طرح پہنچادے (۱)۔

صحابہؓ کے حالات سے جولوگ باخبر ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل اوراس دعا میں اپنے کوشامل کرنے کے لیے انھوں نے ہرگز کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا ہوگا۔

عہد صحابہؓ: عہدِ صحابہ میں بھی حدیثوں کو ازبر کرنے کا بیش از بیش اہتمام تھا، حضرات صحابہؓ اپنے شاگردوں کو یاد کرنے کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے، اور محفوظ رکھنے کی تدبیر بھی بتایا کرتے تھے:

۱- حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے:

تذاكروا هذا الحديث لا ينفلت منكم (دارمی ص ۷۸)	حدیثوں کو آپس میں مذاکرہ (دور) کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تمھارے ہاتھ سے نکل جائے۔

۲- یہ بھی فرمایا کرتے تھے:

(۱) اس مضمون کو تقریباً ان ہی الفاظ میں آنحضرت ﷺ سے ابن مسعودؓ، عائشہؓ، زید بن ثابتؓ، جبیر بن مطعمؓ، انسؓ، ابوہریرہؓ، عمیر بن قتادہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، ابن عمرؓ، معاذ بن جبلؓ، نعمان بن بشیر عن ابیہؓ اور زید بن خالد نے روایت کیا ہے، کنزالعمال ۵/۲۲۰ و ۵/۲۲۱ و ۵/۲۲۲، ۱۲ منہ

رَدوا الحدیث و استذکروہ فانہ ان لم تذکروہ ذھب (دارمی ص ۷۸)	حدیث کو (بار بار پڑھ کر) دہرایا کرو اور اس کو مستحضر کرو اور اگر اس طرح یاد نہ کرو گے تو جاتی رہے گی۔

۳۔ان کی یہ تاکید بھی تھی کہ ہر روز کچھ حدیث بیان کیا کریں، فرماتے تھے کہ: کوئی یہ نہ خیال کرے کہ ابھی تو کل بیان کیا ہے، لہذا آج نہ بیان کروں گا، نہیں! آج بھی بیان کرو، پھر کل (آئندہ) بھی بیان کرنا۔

۴۔حضرت ابوسعید خدریؓ بھی آپس میں حدیث کے مذاکرہ کی تاکید کیا کرتے تھے (دارمی ص ۷۷ و مستدرک ۱/۹۴) بلکہ وہ اس باب میں اتنے سخت تھے کہ شاگرد اگر درخواست کرتے کہ حدیثیں لکھوا دیجئے، تو انکار کر دیتے تھے، اور فرماتے تھے کہ جس طرح ہم نے آنحضرت ﷺ سے حدیثوں کو سن کر حفظ کیا ہے، تم بھی حفظ کرو (دارمی ص ۶۶)۔

۵۔حضرت علی مرتضیٰؓ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے:

تذاکروا الحدیث فانکم اِن لا تفعلوا یندرسُ (مستدرک ۱/۹۵)	حدیثوں کو باہم یاد کیا کرو، اس لیے کہ ایسا نہ کرو گے تو حدیث مٹ جائے گی۔

۶۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی سخت تاکید تھی کہ:

تذاکروا الحدیث فان ذکر الحدیث حیاتہ (مستدرک ۱/۹۵، دارمی ص ۷۹)	حدیثوں کا مذاکرہ کرتے رہو کہ یہ اس کے بقا کا سامان ہے۔

۷۔حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

تزاوروا و تدارسوا الحدیث و	ایک دوسرے سے ملتے رہو اور باہم

لا تترکوہ یدرس (دارمی ص ۷۹ و کنز العمال ۲۴۲/۵) حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو، اس کو چھوڑ نہ دو کہ فنا ہو جائے۔

صحابہ کرامؓ کے شاگرد اپنے اساتذہ کے ان احکام کا پورا احترام کرتے تھے، اور حدیثوں کے مذاکرہ سے کبھی غافل نہیں رہتے، چنانچہ دارمی (ص ۷۹) اور تذکرہ (ص ۱۱۹) میں عطاء کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابرؓ کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے، تو باہم مذاکرہ کرتے تھے، ہمارے ہم سبقوں میں ابوزبیر کا حافظہ سب سے اچھا تھا، ان کو سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہوتی تھیں۔

مستدرک (۹۴/۱) میں ابن بریدہ کا بیان ہے کہ ہم مسجد میں نماز کے بعد بیٹھ جاتے اور احادیثِ نبویہ کا مذاکرہ کرتے۔

دارمی (ص ۷۹) میں ہے کہ زہری عشاء کی نماز کے بعد حدیث کا مذاکرہ کرنے بیٹھے تو صبح تک یہ مشغلہ جاری رہا۔

دارمی (ص ۷۹) میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں ملتے رہتے ہو، اور کہیں ایک جگہ بیٹھ کر حدیث کا مذاکرہ بھی کرتے ہو؟ شاگردوں نے جواب دیا کہ ہم کو تو اس کا اتنا اہتمام ہے کہ ہمارا کوئی ساتھ کبھی غائب ہو جاتا ہے، تو اگر وہ کوفہ کے آخری سرے پر بھی ملتا ہے تو وہیں جا کر اس سے ملتے ہیں۔

عہدِ تابعین صحابہؓ کے بعد تابعین کا دور آیا تو وہ بھی اپنے شاگردوں کو حدیثوں کو حفظ کرنے کے لیے، دور اور مذاکرہ کی ہدایت کرتے رہے، چنانچہ دارمی میں عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ، زہری اور علقمہ کی وہ ہدایات قریب قریب صحابہ کے مذکورہ بالا الفاظ میں منقول ہیں۔

انہی تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ حارث بن یزید عکلی، قعقاع بن یزید، مغیرہ اور

فضیل عشاء کی نماز کے بعد مذاکرہ کرنے کے لیے بیٹھتے، تو صبح ہی کو یہ مجلس برخاست ہوتی تھی (دارمی ص ۸۷، تہذیب ۲۷۰/۱)۔

یونس کا بیان ہے کہ جب ہم حسن بصری کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے، تو آپس میں اس کا دور اور مذاکرہ کرتے تھے (دارمی ص ۸۷)۔

اسماعیل بن رجاء کا دستور تھا کہ کوئی نہ ملتا تو مکتب کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے حدیثیں بیان کرتے، تاکہ حدیث کی مشق میں ناغہ نہ ہو، اور بھولنے نہ پائیں (دارمی ص ۸۷، تہذیب التہذیب ۲۹۶/۱)

حفظِ حدیث کے لیے صحابہؓ و تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ کا یہ غیر معمولی اہتمام آپ نے ملاحظہ کیا، اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ قدرت کی طرف سے ان حضرات کو کس قدر حیرت انگیز قوتِ یادداشت اور غیر معمولی حافظے عطا ہوئے تھے، جن کی نظیر آج مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے، پس ان حالات اور واقعات کے باوجود یہ خیال قائم کر لینا کہ زبانی روایت پر دارومدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہو گئیں، انصاف کا خون یا تاریخی حقائق سے چشم پوشی اور رنری وہم پرستی ہے۔

صحابہؓ و تابعین کا غیر معمولی حافظہ میں نے ابھی صحابہ و تابعین کی حیرت انگیز قوتِ یادداشت کا جو ذکر کیا ہے، وہ محض خوشِ اعتقادی کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ واقعات کی روشنی میں پوری ذمہ داری کے ساتھ میں نے اس بات کو لکھا ہے۔

اسماء رجال اور تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں پر تو میرے اس بیان کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے، لیکن جن کو یہ موقع نہیں ملا ہے، ان کے اطمینان و تشفی کے لیے چند تاریخی واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

۱- صحابہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کا نام کون نہیں جانتا، مورخ اسلام حافظ ذہبی

کی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں خود انہی کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ تم مالِ غنیمت سے حصہ نہیں مانگتے، میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے علم کی دولت مانگتا ہوں، اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے میری چادر میرے جسم سے اتار کر بیچ میں پھیلا دی، اور حدیثیں بیان کرنا شروع کیں، فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ چادر واپنے سینے سے ملا لو، میں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد سے میرا یہ حال ہو گیا کہ ایک حرف بھی آپ کی حدیث کا مجھ کو نہیں بھولتا تھا (تذکرہ ۱/۳۳)۔

۲- تابعین میں ایک مشہور و معروف مفسر اور حافظِ حدیث قتادہ ہیں، ان کی نسبت امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ قتادہ جو کچھ سن لیتے، ان کو یاد ہو جاتا تھا، ان کے سامنے ایک دفعہ حضرت جابرؓ کا صحیفہ (یعنی حضرت جابرؓ کی روایت کی ہوئی حدیثوں کا مجموعہ) صرف ایک دفعہ پڑھ دیا گیا، ان کو کل یاد ہو گیا، خود قتادہ کا بیان ہے کہ میں نے کبھی کسی استاذ سے دہرانے کی خواہش نہیں کی، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز میرے کان میں پڑے اور وہ میرے دل میں بیٹھ نہ جائے (تذکرۃ الحفاظ ۱/۱۱۶)

۳- ایک نہایت جلیل القدر تابعی امام شعبی ہیں، وہ ایک دن آنحضرت ﷺ کے غزوات کے واقعات بیان کر رہے تھے، اتفاق سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ (صحابیؓ) کا ادھر سے گزر ہوا، اور انھوں نے شعبی کا بیان کرنا سنا، تو فرمایا کہ باوجودیکہ میں ان غزوات میں خود شریک تھا لیکن شعبی کو مجھ سے زیادہ واقعات یاد ہیں، اور وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہیں (تذکرہ ۷۷)۔

شعبی خود کہتے تھے کہ میں نے کبھی کوئی چیز لکھی نہیں، لیکن حافظہ ایسا ہے کہ کسی نے کوئی حدیث بیان کی، تو اس کو بھولا بھی نہیں، اور یہ بھی نہیں ہوا کہ کبھی میں نے (استاذ سے) دوبارہ بیان کرنے کی خواہش کی ہو (تذکرہ ۱/۷۹)۔

یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اشعار ہر چیز سے کم یاد ہیں، تاہم اگر میں تم کو

اشعار سنانا شروع کروں تو ایک مہینہ تک کوئی شعر مکرر نہ سناؤں گا (تذکرہ ۱/۹۷)۔

ابو صالح سمان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اعمش نے ان سے ایک ہزار حدیثیں سنی تھیں، جیسا کہ خود اعمش کا بیان ہے (تذکرہ ۱/۸۲)۔

۵- مکحول خود اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں نے جو چیز اپنے سینہ میں رکھی، پھر جس وقت چاہا، اس کو اپنے سینہ میں موجود پایا (تذکرہ ۲/۱۰۲)۔

۶- زہری کا بیان ہے کہ میں نے جو علم اپنے سینے میں رکھ لیا، اس کو کبھی نہیں بھولا (تذکرہ ۱/۱۰۳)۔

سعید کا بیان ہے کہ زہری سے ایک شخص نے حدیثیں لکھوانے کی درخواست کی، انھوں نے اس کو چار سو حدیثیں لکھوا دیں، ایک مہینہ کے بعد اس شخص سے پھر ملاقات ہوئی، تو اس نے کہا وہ نوشتہ (جس میں چار سو حدیثیں لکھی تھیں) کھو گیا، زہری نے دوبارہ وہ حدیثیں اس کو لکھوا دیں، جب اس نے دونوں نوشتوں کا مقابلہ کیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا (تذکرہ ۱/۱۰۴)۔

زہری کے بھتیجے کا بیان ہے کہ زہری نے صرف اسی ۸۰ راتوں میں قرآن پاک یاد کر لیا تھا، خود زہری کا بیان ہے کہ میں نے کسی حدیث کے متعلق کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لیے استاذ سے نہیں کہا، نہ کسی حدیث میں کبھی شک پیدا ہوا، صرف ایک دفعہ ایک حدیث میں شک ہوا تھا، مگر میں نے اس کی نسبت بھی اپنے ہم سبق سے پوچھا تو وہ اسی طرح تھی، جس طرح میں نے اس کو یاد کیا تھا (تذکرہ ۱/۱۰۴)۔

تابعین کے بعد کے طبقے

صحابہ و تابعین کے بعد کے طبقوں میں بھی قوتِ یادداشت کی یہی فراوانی تھی، بلکہ ان طبقوں میں حافظہ کی بعض مثالیں پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ملتی ہیں۔

۱- مغیرہ ضبی (تبع تابعی) کے حافظہ کا حال خود ان کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ جو بات ان کے کان میں پڑ گئی، اس کو پھر کبھی نہیں بھولے (تذکرہ ۱/۱۳۵)۔

۲- عمرو بن الحارث مصری (تبع تابعی) کی نسبت ابوحاتم رازی کا قول ہے کہ اپنے زمانہ میں سب سے بڑے حافظ تھے، حافظہ میں ان کا ہمسر کوئی نہ تھا، اور ابن وہب کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ قوی حافظہ کا انسان نہیں دیکھا (تذکرہ ۱/۱۷۳)۔

۳- معمر (تبع تابعی) کا بیان ہے کہ میں نے چودہ برس کی عمر میں قتادہ سے حدیثیں سنی تھیں، جو کچھ اس وقت سنا تھا، وہ آج تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے سینہ میں لکھا ہوا ہے (تذکرہ ۱/۱۷۹)

۴- شعبہ (تابعی) کو اتنی کثرت سے حدیثیں یاد تھیں کہ ابوداود طیالسی نے ان سے سات ہزار حدیثیں سنی تھیں، اور غندر نے بھی اتنی ہی حدیثیں ان سے سنی تھیں۔

شعبہ کا خود اپنا بیان ہے کہ صرف ایک ابوالزبیر سے سنی ہوئی مجھ کو سو حدیثیں ازبر ہیں (تذکرہ ۱/۱۸۳ و ۱/۱۸۴)۔

۵- حماد بن سلمہ (تبع تابعی) کے پاس قیس بن سعد کی مرویات کے سوا کوئی حدیث لکھی ہوئی نہ تھی، بایں ہمہ یحییٰ بن الفریس کے پاس حماد سے سنی ہوئی دس ہزار تھیں، اور عمرو بن عاصم کا بیان ہے کہ میں نے حماد سے دس ہزار سے بھی زیادہ حدیثیں

سن کر لکھی ہیں (تذکرہ ۱/۱۹۰)۔

۶- سفیان ثوری کا بیان ہے کہ میں نے اپنے سینہ کو (احادیث کی) جو امانت بھی سپرد کر دی، اس نے کبھی خیانت نہیں کی۔ یحییٰ قطان کا بیان ہے کہ میں نے سفیان سے زیادہ حدیث کا حافظ نہیں دیکھا (تذکرہ ۱/۱۹۱)۔

۷- اسرائیل کا بیان ہے کہ میں ابواسحاق کی مرویات کو اس طرح یاد رکھتا تھا، جیسے قرآن کی سورتوں کو (تذکرہ ۱/۱۹۹)۔

۸- ابن سعد کا بیان ہے کہ وُہیب اپنی یاد سے حدیثیں لکھواتے تھے (تذکرہ ۱/۲۱۷)۔ باوجودیکہ ان کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

۹- ہُشیم کے پاس بیس ہزار حدیثیں تھیں، ابن مہدی کا بیان ہے کہ وہ سفیان ثوری سے بھی بڑھ کر حافظِ حدیث تھے (تذکرہ ۱/۲۲۹)۔ ثوری کا حال اوپر پڑھ چکے ہو۔

۱۰- داود ضبی کا بیان ہے کہ اسماعیل بن عیاش کے ہاتھ میں میں نے کتاب کبھی نہیں دیکھی، وہ اپنی یاد سے حدیثیں سناتے تھے، اور ان کو تیس ہزار حدیثیں یاد تھیں (تذکرہ ۱/۲۳۴)۔

۱۱- ابن عیینہ کے پاس سات ہزار کے قریب حدیثیں تھیں، اور ان سب کو وہ اپنی یاد سے بیان کرتے تھے (تذکرہ ۱/۲۴۲)۔

۱۲- ابن المبارک کے والد ایک دفعہ ان پر خفا ہوئے تو کہا کہ تیری کتابیں میں پا گیا تو جلا دوں گا، ابن المبارک نے کہا کہ اس سے کیا ہو جائے گا، وہ سب میرے سینہ میں ہیں، علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے کہ ایک رات ابن المبارک مسجد سے نکلے، میں بھی ساتھ ہولیا، دروازہ پر انھوں نے حدیث کا ذکر چھیڑ دیا، مذاکرہ کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ جب فجر کی اذان کے لیے مؤذن آیا تو ہم ابھی مذاکرہ ہی کر

رہے تھے (تذکرہ ۱/۲۵۵)۔

۱۳- عیسیٰ بن یونس کو اپنی حدیثیں اس قدر یاد تھیں کہ فرماتے تھے: اگر میری کتاب میں کہیں ایک واؤ بھی کوئی بڑھا دے تو وہ مجھ سے چھپ نہیں سکتا (تذکرہ ۱/۲۵۹)۔

۱۴- یحییٰ بن الیمان کو ایک مجلس میں پانچ سو حدیثیں یاد ہو جاتی تھیں (تذکرہ ۱/۲۶۳)۔

۱۵- ابومعاویہ نابینا تھے، اس کے باوجود علی بن المدینی کا بیان ہے کہ میں نے اُن سے ڈیڑھ ہزار حدیثیں سن کر لکھی ہیں۔ جریر کا بیان ہے کہ ہم اعمش کے پاس سے حدیثیں سن کر اٹھتے تھے، تو باہم مذاکرہ کرتے تھے، ہم سب میں ابومعاویہ (نابینا) سے زیادہ کسی کو یاد نہ ہوتا تھا۔ خود ابومعاویہ کا بیان ہے کہ آنکھ والے لوگ اعمش کی مجلس میں میرے محتاج تھے، اعمش کے کل شاگرد میرے دروازہ پر آتے تھے اور میں ان کی ساری سنی ہوئی حدیثیں بول دیتا تھا، وہ لکھ لیتے تھے (تذکرہ ۱/۲۷۱)۔

۱۶- مروان بن معاویہ کو اپنی کل حدیثیں یاد تھیں (تذکرہ ۱/۲۷۲)۔

۱۷- ابن معین کا بیان ہے کہ حفص بن غیاث نے بغداد اور کوفہ میں جتنی حدیثیں بیان کی ہیں، سب اپنی یادداشت سے بیان کی ہیں، کتاب کبھی نہیں نکالی، اور تین چار ہزار حدیثیں ان کی یاد سے لوگوں نے لکھی ہیں (تذکرہ ۱/۲۷۴)

۱۸- ابن مہدی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفیان نے مجھ سے کہا کہ کسی محدث کو مذاکرہ کرنے کے لیے میرے پاس لاؤ، میں یحییٰ قطان کو ساتھ لے گیا، سفیان نے ان سے مذاکرہ کیا تو ہکا بکا رہ گئے (تذکرہ ۱/۲۷۶)۔

۱۹- ولید بن مسلم کو بڑی لمبی لمبی حدیثیں اور ملاحم کی پیشین گوئیوں والی روایتیں خوب یاد تھیں، ابواب بھی ان کو ازبر تھے (۱/۲۷۹)۔

۲۰- احمد بن صالح کا بیان ہے کہ ابن وہب نے ایک لاکھ حدیثیں بیان کی

ہیں (تذکرہ ۱/۲۸۰)۔

۲۱-امام احمد کا قول ہے کہ میں نے وکیع سے بڑھ کر کسی کو حافظ نہیں پایا، ابو حاتم کا قول ہے کہ وکیع، ابن المبارک سے بڑھ کر حافظ تھے، ابوداؤد کا بیان ہے کہ وکیع کے ہاتھ میں حدیث بیان کرنے کے وقت کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی (تذکرہ ۱/۳۰۷)۔

۲۲-وکیع کا بیان ہے کہ محاربی لمبی حدیثوں کے بڑے حافظ تھے (تذکرہ ۱/۲۸۷)

۲۳-یزید بن ہارون کا خود اپنی نسبت یہ بیان ہے کہ مجھ کو بیس ہزار حدیثیں سند کے ساتھ یاد ہیں، اور وہ بھی اتنی پکی کہ ان میں کوئی ایک حرف بھی ملا دے تو جانوں۔

زیاد بن ایوب کا بیان ہے کہ میں نے یزید کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی (تذکرہ ۱/۲۹۲)۔

۲۴- زیاد بن ایوب کا بیان ہے کہ ابن علیہ کے ہاتھ میں میں نے کبھی کتاب نہیں دیکھی، ابوداؤد کا بیان ہے کہ ابن علیہ سے حدیث میں کہیں بھول چوک نہیں ہوئی (تذکرہ ۱/۲۹۶)۔

۲۵-قواریری کا بیان ہے کہ ابن مہدی نے بیس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے مجھ کو لکھوائیں، ذہلی کا بیان ہے کہ ابن مہدی کے ہاتھ میں میں نے کبھی کتاب نہیں دیکھی (تذکرہ ۱/۳۰۲ و ۳۰۳)۔

۲۶-محمد بن عبید طنافسی کی حدیثیں چار ہزار تھیں اور سب از بر تھیں (تذکرہ ۱/۳۰۵)

۲۷- ابوداؤد طیالسی کی یاد سے لوگوں نے چالیس ہزار حدیثیں لکھیں (تذکرہ ۱/۳۲۱)۔

۲۸-ابواحمد زبیری کے پاس سفیان ثوری کی احادیث کا بہت بڑا مجموعہ تھا، فرماتے تھے کہ وہ مجموعہ چوری ہو جائے تو مجھ کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ سارے کا سارا مجھ کو یاد ہے (تذکرہ ۱/۳۲۵)۔

۲۹- ابو عاصم کو ایک ہزار کھری حدیثیں، یاد تھیں اور ہمیشہ اپنی یاد سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے (۱/۳۲۴)۔

۳۰- علی بن الحسن بن شقیق، ابن المبارک کی کتابوں کے سب سے بڑے حافظ تھے (۳۴۷)۔

۳۱- سلیمان بن حرب کی نسبت ابوحاتم کا بیان ہے کہ ان کی حدیثوں میں سے دس ہزار حدیثیں ظاہر ہوئی ہیں، اور میں نے ان کے ہاتھ میں کتاب کبھی نہیں دیکھی (۳۵۵)۔

۳۲- سعید بن منصور (المتوفی ۲۲۷ھ) نے دس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، جیسا کہ حرب کرمانی کا بیان ہے (تذکرہ ۲/۵)۔

۳۳- ابوزرعہ کا بیان ہے کہ امام احمد کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔

۳۴- ابوداؤد خفاف کا بیان ہے کہ اسحٰق بن راہویہ نے گیارہ ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، پھر ان کو اپنی کتاب سے پڑھ کر سنایا، تو نہ کہیں ایک حرف گھٹا نہ بڑھا۔

۳۵- امام بخاری کے حافظہ کا حال حاشد بن اسمٰعیل نے یوں بیان کیا ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ حدیث سننے کے لیے محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتے تھے، تو لکھتے نہ تھے، بہت دنوں تک ہم یہی دیکھتے رہے، ان سے اس باب میں ہم کچھ کہتے تو وہ کچھ نہ بولتے، ایک دن انھوں نے کہا کہ تم لوگ مجھ کو بہت کہتے رہے، لاؤ مجھ کو دکھاؤ تم نے اب تک کتنی حدیثیں لکھی ہیں، ہم نے دکھایا تو پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں تھیں، اس کے بعد انھوں نے ہماری بیاضیں ہم کو دے دیں، اور ان حدیثوں کو اپنی یاد سے زبانی سنانا شروع کیا، تو کل کی کل سنا دیں، ان کی یادداشت اتنی درست تھی کہ ہم نے ان کی یاد سے اپنی بیاضوں کی غلطیاں ٹھیک کیں، اس کے بعد بخاری

نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں اپنا وقت برباد کرنے کے لیے روزانہ آتا ہوں (تذکرہ ۱۳۳/۲، مقدمہ فتح الباری ۵۶۴)۔

خود بخاری فرماتے تھے: مجھ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح یاد ہیں (تذکرہ ۱۲۳/۲، مقدمہ ۵۷۵)۔

بخاری کا یہ واقعہ بھی نہایت مشہور ہے کہ جب وہ بغداد گئے ہیں، تو وہاں کے محدثین نے متفق ہو کر ان کے حافظہ کا امتحان کرنا چاہا، اور اس کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ سو حدیثیں چھانٹ کر ان کی سند و متن کو الٹ پلٹ دیا گیا، اس کی سند اس کے ساتھ اور اس کی اس کے ساتھ جوڑ دی گئی، پھر دس محدث چنے گئے، اور ان میں سے ہر ایک کو دس دس حدیثیں دی گئیں کہ جب مجلس میں سب لوگ باطمینان بیٹھ جائیں، تو ایک آدمی آگے بڑھ کر ایک حدیث الٹی پلٹی سند و متن سے پڑھ کر امام بخاری سے پوچھے کہ آپ کو یہ حدیث معلوم ہے، اسی طرح دسوں حدیثوں کو پڑھ پڑھ کر پوچھتا جائے، جب وہ فارغ ہو جائے، تو دوسرا آگے بڑھے، اسی طرح دسوں آدمی پوچھیں، یہ طے کر کے بخاری کو ایک مجلس میں دعوت دے کر بلایا گیا اور بہت بڑا مجمع کیا گیا، اس مجمع میں طے شدہ تجویز کے مطابق جو لوگ مقرر ہوئے تھے، انھوں نے پوچھنا شروع کیا، بخاری نے ہر سوال کے جواب میں کہا کہ میں اس کو نہیں جانتا، جب وہ دسوں آدمی پوچھ چکے، تو بخاری نے سب سے پہلے پوچھنے والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے پہلی حدیث یوں پڑھی ہے، حالانکہ وہ اس طرح ہے، اور دوسری حدیث کی سند یہ بیان کی ہے، حالانکہ اس کی سند یوں ہے، اسی طرح فرداً فرداً ہر حدیث کی سند و متن کی نسبت بیان کر گئے، اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اور ان کے بے مثال حافظہ کے قائل ہو گئے (مقدمہ ۵۷۳)۔

۳۶- امام ترمذی کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مکہ کے راستہ میں ان

کو معلوم ہوا کہ فلاں محدث آ رہے ہیں، ترمذی نے اس سفر سے پہلے اس محدث کی روایت کی ہوئی حدیثیں کسی شخص سے لے کر نقل کر لی تھیں، اور ان کا خیال تھا کہ وہ اجزاء ان کے ساتھ موجود ہیں، اس لیے چاہا کہ اس محدث سے وہ اجزاء سن کر باقاعدہ سماع حاصل کریں، لیکن تلاش کیا تو وہ اجزاء سفر میں ساتھ نہ تھے، دل نے گوارا نہ کیا کہ یہ سنہرا موقع ہاتھ سے چلا جائے، اس لیے ایک سادی بیاض ہاتھ میں لے کر اس محدث کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ کی کچھ مرویات میں نے ایک شخص سے لے کر نقل کی ہیں، آپ اپنی زبان سے ان حدیثوں کو سنا دیجئے، انھوں نے قبول کر لیا، ترمذی وہی سادی بیاض ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے، اور محدث نے وہ حدیثیں اپنی یاد سے سنانا شروع کیں، اتفاق سے محدث کی نظر بیاض پر جا پڑی، دیکھا تو وہ سادی تھی، محدث نے خفا ہو کر کہا کہ تم کو شرم نہیں آتی؟ ترمذی نے اس کے بعد قصہ سنایا اور کہا کہ وہ اجزاء اگرچہ ساتھ نہیں ہیں، مگر اس میں کی سب حدیثیں مجھ کو زبانی یاد ہیں، محدث نے کہا: اچھا سناؤ، ترمذی نے مسلسل تمام حدیثیں سنا دیں، محدث نے پوچھا کہ ان کو تم نے رٹ لیا تھا، ترمذی نے کہا نہیں، پھر کہا آپ ان کے علاوہ دوسری حدیثیں سنا کر ابھی امتحان کر لیجئے، چنانچہ محدث نے اپنی مخصوص چالیس حدیثیں سنا کر ان سے کہا کہ اب یہ حدیثیں تم سناؤ، ترمذی نے اسی وقت اول سے آخر تک سنا دیں، وہ محدث محو حیرت ہو گئے، اور فرمایا کہ میں نے تم سا کوئی آدمی نہیں دیکھا (تہذیب التہذیب ۳۸۶/۹، تذکرہ ۱۸۸/۲)۔

۳۷- ایک شخص ابوزرعہ کے پاس آیا، اور کہا کہ میرے منھ سے یہ نکل گیا ہے کہ اگر ابوزرعہ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو میری بی بی کو طلاق! ابوزرعہ نے کہا تمھاری بی بی مطلقہ نہیں ہوئی (یعنی مجھ کو اتنی حدیثیں یاد ہیں) (تذکرہ ۱۲۴/۲)۔

ابوزرعہ فرماتے تھے کہ ایک لاکھ حدیثیں مجھ کو اسی طرح یاد ہیں جس طرح

کسی کو قل ھو اللہ یاد ہوتی ہے (تہذیب ۷/۳۳)۔

نیز فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے جو دفتر حدیثوں کے لکھے ہیں، ان میں سے کسی کسی کو لکھے ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں، اور اس وقت سے آج تک اس کو پھر دیکھا نہیں ہے، بایں ہمہ میں ہر حدیث کی نسبت جانتا ہوں کہ وہ کس کتاب میں، کس ورق میں، کس صفحہ میں، اور کس سطر میں ہے (تہذیب ۷/۳۳)۔

۳۸- ابو اللیث کا اپنی نسبت بیان ہے کہ مجھ کو دس ہزار غیر مکرر حدیثیں یاد ہیں (تذکرہ ۲/۱۴۹)۔

۳۹- ابن عاصم کی کتابیں ایک ہنگامہ میں ضائع ہو گئیں، تو انھوں نے اپنی یاد سے پچاس ہزار حدیثیں لکھ لیں (تذکرہ ۲/۱۹۴)۔

۴۰- خطیب کا بیان ہے کہ کہ جزرہ ایک مدت تک اپنی یاد سے حدیثیں بیان کرتے رہے، اس لیے کہ کوئی کتاب ساتھ نہیں لی تھی (تذکرہ ۲/۱۹۵)۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعات پڑھتے پڑھتے اب آپ گھبرا گئے ہوں گے، اس لیے اتنی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ اس موضوع پر تو مستقل ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

روایت میں محدثین کی بے نظیر احتیاط

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے، اور وہ یہ کہ آنحضرت ﷺ نے جہاں اپنی حدیثوں کی اشاعت وتبلیغ کے لیے بڑی بڑی تاکیدیں کی ہیں، وہاں اس بات کی بھی نہایت سخت تاکید کی ہے، کہ کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے، اس لیے ابتدا ہی سے محدثین کا گروہ حدیثوں کی روایت کرنے میں بے حد محتاط رہا ہے، چنانچہ بعض صحابہؓ صرف اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کچھ کمی بیشی نہ ہوجائے، بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے، جیسا کہ حضرت زبیرؓ کا واقعہ صحیح بخاری (۲۱/۱) میں مذکور ہے۔

حضرت انسؓ کا یہ حال تھا کہ جس حدیث میں ان کو ذرا بھی شبہہ ہوجاتا کہ یہ حدیث خوب اچھی طرح یاد نہیں ہے، تو وہ اس کو بیان ہی نہیں کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بیان کرتا (دارمی ص ۴۲)۔

امام ربانی محمد باقر کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام تھا، کہ حدیث میں ذرہ برابر بھی کمی بیشی نہ ہو (تذکرہ ۳۷)۔

چنانچہ صحیح مسلم (۳۲/۱) میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ نے یہ حدیث بیان کی: بُنِيَ الاسلامُ علی خمسٍ: شهادةِ أن لا اله الا الله و أن محمداً رسول الله، و اقام الصلوٰة، و ايتاء الزكوٰة، و صيام رمضان، و الحج، حضرت ابن عمرؓ کے بیان کرنے کے بعد مجلس میں کسی شخص نے اس حدیث کو دہرایا، تو یوں کہہ دیا و الحج و صيام رمضان، حضرت ابن عمرؓ نے اس کو فوراً ٹوکا اور فرمایا: یوں نہیں بلکہ و صيام رمضان و الحج، میں نے آنحضرت ﷺ سے اسی طرح سنا ہے۔

غور فرمایئے کہ باوجودیکہ معنی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی، پھر بھی جس ترتیب سے حدیث کے الفاظ آنحضرت ﷺ سے سنے تھے، اس میں یہ معمولی سا تغیر بھی ان کو گوارا نہ تھا۔

دارمی (ص ۵۱) میں عبداللہ بن عمرؓ کا ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ ایک دوسری حدیث کے باب میں بھی مذکور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی نسبت تذکرۃ الحفاظ میں مذکور ہے:

كان ممن يتحرى في الاداء و يشدد في الرواية و يزجر تلامذته عن التهاون في ضبط الالفاظ (۱۳/۱)	ان کا شمار ان حضرات میں ہے جن کو اداء حدیث میں بے حد احتیاط اور روایت کے باب میں بڑا تشدد تھا اور وہ اپنے شاگردوں کو الفاظ حدیث (۱) کے ضبط کرنے میں سستی پر بہت ڈانٹتے رہتے تھے۔

حضرت زید بن ارقمؓ کا جب بڑھاپا آیا، اس وقت کوئی شخص حدیث بیان کرنے کو کہتا، تو فرماتے کہ اب ہم بوڑھے ہو گئے، اور آنحضرت ﷺ کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے (ابن ماجہ ص ۴)۔

اسی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے شاگردوں کو ہدایت کیا کرتے تھے، کہ جب تم حدیث کی روایت کرنے کا ارادہ کرو، تو پہلے اس کو تین دفعہ دہرا لیا کرو (دارمی ص ۷۸)۔

نیز اسی شدت احتیاط ہی کی وجہ سے حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی بڑی تاکید تھی کہ آنحضرت ﷺ سے حدیثوں کی روایت کم کی جائے۔

صحابۂ کرامؓ کے یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ ہی انصاف سے کہیئے کہ

(۱) امام مالک کا یہ حال تھا کہ وہ "ب" اور "ت" کا بھی خیال رکھتے تھے (تذکرہ ۱/۱۹۸)

جس جماعت کو اس قدر احتیاط کا پاس ولحاظ ہو، اس کی نسبت یہ خیال قائم کرنے کا تو کسی درجہ میں کوئی امکان ہی نہیں، کہ اس نے جان بوجھ کر غلط تو درکنار کوئی مشکوک ہی بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی ہوگی۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جب احتیاط کا یہ عالم تھا، اور حدیثوں کی روایت سے بھی چارہ نہ تھا، تو لازمی طور پر حدیثوں کو یاد رکھنے اور ان کو بعینہٖ حافظہ میں محفوظ رکھنے کا بھی انتہائی اہتمام ہوگا، اس حالت میں بھول چوک سے بھی حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہونا بعید از قیاس ہے۔

خصوصاً جب کہ تاریخ شاہد ہے، کہ شروع ہی سے اس کا بھی اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا، تو مزید اطمینان کے لیے کوئی دوسرا اس کا موید تلاش کیا جاتا تھا، جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ (۲/۱) میں مذکور ہے، کہ جب حضرت مغیرہؓ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ نے دادی کو پوتے کی میراث سے چھٹا حصہ دلوایا ہے، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی آنحضرت ﷺ سے اس بات کو نقل کرنے میں تمھارا شریک ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت محمد بن مسلمہؓ بھی اس کو جانتے ہیں، چنانچہ انھوں نے آکر شہادت دی، تو حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ سے ایک حدیث بیان کی، تو انھوں نے حکم دیا کہ اس پر کوئی دوسری شہادت پیش کرو، حضرت ابوموسیٰؓ انصار کے مجمع میں گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی نے آنحضرت ﷺ سے فلاں حدیث سنی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم سب نے یہ حدیث سنی ہے، حضرت ابوموسیٰؓ نے ان میں سے ایک انصاری کو ساتھ لیا، اور حضرت عمرؓ کے سامنے ان سے شہادت دلوائی (تذکرہ ۶/۱)۔

خود حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک حدیث کو بیان کرنا شروع کیا، تو فرمایا کہ

ڈر لگتا ہے کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے، لیکن عمار نے بھی میرے ساتھ اس حدیث کو سنا ہے، اس لیے میں بیان کرتا ہوں، تم عمار کے پاس آدمی بھیج کر ان سے بھی تصدیق کرا لو، چنانچہ عمار کو بلا کر پوچھا گیا، تو انھوں نے حضرت عمرؓ کے بیان کی تصدیق و تائید کی (ابوداود طیالسی ص ۱۰)۔

ان واقعات کے ذکر کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جب ایک کے بیان کی دوسرے سے تصدیق کرانے کا بھی دستور تھا، تو اس کے باوجود یہ خیال کرنا کہ صرف حافظہ پر مدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئی ہوں گی، نرا وہم ہی وہم ہے، تنہا ایک آدمی کے بیان میں ایسا شک کیا بھی جا سکے تو دو ہو جانے کی صورت میں ایسا شک قطعاً درخورِ التفات نہیں ہے۔

بلکہ میں تو جرأت کر کے یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ایسا شکی مزاج انسان قرآنی تعلیمات کی روح سے یقیناً بے بہرہ ہے، قرآن پاک نے جہاں یہ تعلیم دی ہے کہ دو پسندیدہ مرد گواہ بنانے کے لیے نہ ملیں، تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں گواہ بنا لی جائیں، وہاں خود ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ دو عورتوں کو گواہ بنانے کے لیے اس لیے کہا کہ اگر ایک عورت بھولے بھٹکے گی، تو دوسری عورت یاد دلا دے گی ﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى﴾ [بقرہ]۔

حدیث کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والے آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ قرآن پاک نے دو ہو جانے کے بعد اس احتمال و شک کا کہ ممکن ہے دو بھی بھول جائیں اور دونوں کو سہو و نسیان ہو جائے، قطعاً اعتبار نہیں کیا، اور اس پر بھی غور کریں کہ دو عورتوں کے باب میں ایسے شک و وہم کا قرآن نے اعتبار نہیں کیا، تو دو مردوں کے باب میں اس کا کب اعتبار ہو سکتا ہے، جب کہ قرآن پاک کے اسی مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مرد اس باب میں دو عورتوں کے برابر ہے۔

محدثین پر سلطنت کی ہواخواہی کا الزام

حدیث کے بے اعتباری کی ایک وجہ ''حق گو'' صاحب نے یہ بھی تراشی اور گڑھی ہے کہ محدثین نے حدیثوں میں سلطنت کے جذبات وعواطف کی رعایت کی ہے۔

محدثین کے اعلیٰ کیرکٹر، ان کی نہایت بلند اخلاقی جرأت اور ان کی بے مثل صداقت وامانت پر ''حق گو'' صاحب کا یہ نہایت سخت حملہ ہے، ''حق گو'' صاحب کو اس لحاظ سے تو ہم معذور سمجھتے ہیں کہ غلام قوم کا ایک غلام فرد، اور وہ بھی حکومت کا تنخواہ دار نوکر اس اخلاقی جرأت کا تصور بھی نہیں کرسکتا، جو محدثین کا طرۂ امتیاز تھی۔

لیکن تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنے میں وہ کسی طرح معذور قرار نہیں دیے جاسکتے، تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ محدثین میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو حکومت سے ایسا سخت اختلاف تھا، جس کی وجہ سے وہ حکومت کے موردِ عتاب تھے، مثلاً:

۱- سعید بن جبیر کو حجاج کی حکومت سے ایسا اختلاف تھا کہ اسی اختلاف کی بنا پر ان کو حجاج نے نہایت بے دردی سے قتل کرڈالا (تذکرہ ۱/۷۲)۔

۲- یحییٰ بن ابی کثیر کو حکومت بنی امیہ پر نکتہ چینی کرنے کی وجہ سے بڑے مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا، حتی کہ مار بھی کھانا پڑی (تذکرہ ۱/۱۲۱)۔

محدثین میں بہت سے وہ لوگ تھے، جنھوں نے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کے سامنے ان پر نکتہ چینی کی اور حق بات کہنے میں جان کی پروانہیں کی۔

۳- اس سلسلہ میں امام اوزاعی کا واقعہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے، حافظ ذہبی نے سفیان وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب خلیفہ عباسی کا چچا عبداللہ بن علی شام میں داخل ہوا، اور بنوامیہ کو چن چن کے مرواچکا، تو ایک دن اس نے اس طرح دربار سجانے کا حکم دیا کہ ایک صف ایسے جوانوں کی آراستہ کی جائے جن

کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں ہوں، دوسری صف ان کی ہو جن کے ہاتھوں میں بلم ہوں، تیسری صف میں وہ سپاہی ہوں جن کے ساتھ کافرکوب ہوں، اور چوتھی صف میں وہ سپاہی کھڑے کیے جائیں جن کے ساتھ گرز ہوں، جب حکم کے مطابق دربار سج چکا تو ایک پیادہ بھیج کر اس نے اوزاعی کو بلوایا، اوزاعی بارگاہ کے دروازہ پر پہونچے تو سواری سے اتار لیے گئے اور دائیں بائیں سے دو سپاہی ان کے دونوں بازو تھام کر صفوں کے بیچ میں لے چلے، جب اتنے قریب پہونچ گئے جہاں سے عبداللہ ان کی بات سن سکے، تو وہاں ان کو کھڑا کر دیا، اس کے بعد عبداللہ اور اوزاعی میں حسب ذیل گفتگو ہوئی:

عبداللہ- تم عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی ہو؟

اوزاعی- ہاں! خدا امیر کی اصلاح فرمائے۔

عبداللہ- بنی امیہ کے قتل کے باب میں تمھارا کیا خیال ہے؟

اوزاعی- آپ سے اور ان سے کچھ معاہدے تھے، جن کی پابندی اور عہد کا ایفا ان پر لازم تھا۔

عبداللہ- اجی صاحب! اس کو چھوڑیئے، فرض کیجئے کہ ہمارے ان کے کوئی معاہدہ اور ہم سے ان سے کوئی عہد و پیمان نہ رہا ہو۔

اوزاعی- (سنے دیکھا کہ اب صاف صاف جواب کے سوا چارہ کار نہیں ہے، اور یہ بھی یقینی ہے کہ صاف جواب دینے کے بعد جان بچنا بھی ممکن نہیں ہے، مرنے کو کس کا دل چاہتا ہے، مگر میں نے سوچا کہ اللہ کے حضور میں ایک دن کھڑا ہونا ہے، اس لیے میں نے نڈر ہو کر کہا کہ) اس صورت میں ان کا قتل آپ پر حرام تھا۔

یہ سنتے ہی وہ آگ بگولا ہو گیا، گردن کی رگیں پھول گئیں اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کر بولا۔

عبداللہ- یہ تم نے کیسے کہا اور کیوں کہا؟

اوزاعی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون تین ہی صورتوں میں روا ہو سکتا ہے، شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے، یا کسی کو قتل کر دے، یا مرتد ہو جائے، (اور بنو امیہ جن کو تم نے قتل کرایا ہے، ان میں سے کسی جرم کے مرتکب نہ تھے)

عبداللہ۔ اجی کیا دیانۃً حکومت و خلافت ہمارا (ہاشمیوں کا) ہی حق نہیں ہے؟

اوزاعی۔ وہ کیسے؟

عبداللہ۔ کیا آنحضرت ﷺ حضرت علیؓ ہاشمی کو اپنا وصی نہیں بنا گئے تھے؟

اوزاعی۔ اگر وصی بنا گئے ہوتے، تو حضرت علیؓ صفین کے موقع پر دو شخصوں کو حکم مان کر یہ نہ کہتے کہ تم جس کو حاکم و خلیفہ مقرر کر دو مجھے قبول و منظور ہے۔

یہ سن کر عبداللہ بالکل خاموش ہو گیا، اس کے غصہ کا پارہ آخری ڈگری پر پہنچ چکا تھا، اور امام اوزاعی خیال کر رہے تھے کہ اب میرا سر میرے سامنے گرا چاہتا ہے کہ اتنے میں عبداللہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس کو دربار سے نکالو، اوزاعی دربار سے نکل آئے، لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ دیکھا ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے پاس چلا آ رہا ہے، یہ سمجھے کہ میرا سر قلم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے جلدی سے اپنی سواری سے اترے کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں، اور اللہ اکبر کہہ کے نیت باندھ لی، ابھی نماز ہی میں تھے کہ سوار آ پہنچا، جب فارغ ہوئے تو اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے یہ اشرفیاں آپ کے پاس بھجوائی ہیں، اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں نے ان اشرفیوں کو گھر پہنچنے سے پیشتر ہی تقسیم کر کے ختم کر دیا (تذکرہ ۱/۱۷۰)۔

۴۔ ابن ابی ذئب کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ابوجعفر جیسے پُر ہیبت و بارعب بادشاہ کے سامنے بھی وہ حق بات کہنے میں ذرا نہ دبے، اور صاف کہہ دیا، کہ تیرے دروازے پر کھلم کھلا ظلم کی گرم بازاری ہے (تذکرہ ۱۸۰)۔

ابونعیم کا بیان ہے کہ جس سال خلیفہ منصور نے حج کیا ہے اسی سال مجھ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی تھی، یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ منصور جب مکہ معظمہ پہنچا، تو اس نے ابن ابی ذئب کو بلا بھیجا، جب وہ آئے تو دار الندوہ میں ان کو اپنے ساتھ بیٹھا کر پوچھا کہ حسن بن زید (علوی جو منصور کی طرف سے مدینہ کے قاضی تھے، مگر منصور کسی بات پر ان سے برہم ہو گیا تھا، اور قضا سے برطرف کر کے ان کو جیل خانہ بھجوا دیا تھا) کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے؟ ابن ابی ذئب نے کہا وہ انصاف شعار و عدل گستر تھے، منصور نے کہا کہ اور میری نسبت کیا رائے ہے؟ ابن ابی ذئب نے پہلے سکوت کیا، لیکن منصور نے بار بار پوچھا تو ابن ابی ذئب نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کر کے صاف فرمایا کہ اس گھر کے مالک کی قسم کہ تو بے انصاف و ناحق پرست ہے۔

منصور کے دربان ربیع نے یہ تلخ اور بے باکانہ جواب سن کر ابن ابی ذئب کی داڑھی پکڑ لی، مگر منصور نے اس کو ڈانٹا کہ حرامزادے چھوڑ دے۔

ابن ابی ذئب منصور کے بیٹے مہدی کے عہدِ حکومت میں بھی زندہ تھے، چنانچہ جس وقت مہدی نے حج کیا ہے، اور حج سے فارغ ہو کر روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے مسجد نبوی میں حاضری دی، تو مسجد میں کوئی ایسا نہ تھا، جو اس کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا نہ ہو گیا ہو، صرف ایک ابن ابی ذئب تھے، جنھوں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کی، کسی نے کہا کہ حضرت کھڑے ہو جائیے، یہ امیر المؤمنین ہیں، تو برجستہ فرمایا: انما یقوم الناس لرب العالمین. کہ میاں رب العالمین کے لیے لوگ کھڑے ہوا کرتے ہیں۔

مہدی یہ جواب سن کر کانپ گیا اور اس نے ڈانٹا کہ ان کو نہ چھیڑو، میرے بدن کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہو گیا (تذکرہ ۱/۱۸۱)۔

۵- یزید بن ابی حبیب مصری ایک دفعہ بیمار ہوئے، تو مصر کا حاکم حوثرہ ان کی عیادت کو آیا، باتوں باتوں میں اس نے یہ مسئلہ پوچھ لیا، کہ کپڑے میں مچھر یا کھٹمل

کا خون لگا ہو، تو اس سے نماز ہوگی یا نہیں؟ یزید نے یہ سن کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کچھ جواب نہ دیا، جب وہ اٹھ کر جانے لگا، تو یزید نے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ روزانہ کتنی مخلوقِ خدا کا خون بہاتے ہو تو کچھ نہیں، اور کھٹمل یا مچھر کے خون کا مسئلہ دریافت کرنے آئے ہو۔ (تذکرہ ۱/۱۲۲)۔

۶- امام سفیان ثوری مہدی کے دربار میں گئے، تو اس سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے سفر میں صرف بارہ اشرفیاں خرچ کی تھیں، مہدی نے سنا تو اس کو غصہ آ گیا اور گرم ہو کر بولا: تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمھاری سی حالت میں ہو جاؤں، سفیان نے نہایت بے باکی سے کہا کہ اگر میری سی حالت میں ہونا گوارا نہ ہو، تو جس حالت میں تم ہو اس میں بھی نہ ہونا چاہئے (تذکرہ ۱/۱۶۲)۔

۷- خلیفہ منصور حج کو چلا تو سولی دینے والوں کو حکم دے دیا کہ سفیان جہاں مل جائیں ان کو دار پر چڑھا دو، لیکن خدا کی شان کہ مکہ پہنچنے سے پہلے ہی منصور کا انتقال ہو گیا، اور سفیان کو سولی دینے کا منصوبہ خاک میں مل گیا (تہذیب ص ۱۱۴)۔

۸- مہدی اور سفیان کی تیز تیز گفتگو اوپر آپ پڑھ چکے ہیں، آخر آخر میں سفیان اور مہدی کی آپس میں کشیدگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ سفیان کو بصرہ میں روپوش ہونا پڑا اور اسی حالت میں ان کی وفات بھی ہوگئی۔

۹- محدثین میں کتنے حضرات ایسے ہیں، جن سے بادشاہوں نے یہ خواہش کی کہ دولت کدۂ شاہی پر حاضر ہو کر شہزادوں کو حدیثیں سنا جائیں، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا اور نہایت بے پرائی سے ان کی یہ خواہش ٹھکرا دی، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی حاکم نے کسی محدث کو مسئلہ پوچھنے کے لیے بارگاہ میں بلایا، تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ تم خود آؤ، چنانچہ زبان بن عبدالعزیز (مصر کے گورنر کے لڑکے) نے یزید بن ابی حبیب مصری کے پاس پیادہ بھیج کر کہلایا، کہ مجھ کو ایک مسئلہ پوچھنا ہے، ذرا دیر کے

لیے تشریف لائیے، تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ تم خود آکر پوچھ جاؤ، تمھارا میرے پاس آنا تمھارے حق میں خوبی و زیبائش ہے، اور میرا آنا تمھارے لیے عیب و بدنمائی ہے (تذکرہ ۱/۱۲۲)۔

۱۰- مہدی جس وقت مدینہ منورہ میں حاضر ہوا، تو اس نے امام مالک کے پاس دو یا تین ہزار اشرفیاں بھجوائیں، جب مہدی مدینہ سے رخصت ہونے لگا، تو ربیع امام مالک کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین چاہتے ہیں کہ آپ بغداد تک ان کے ہمرکاب تشریف لے چلیں، امام نے جواب دیا کہ سرکارِ رسالت ﷺ کا ارشاد ہے کہ مدینہ کے باشندوں کے لیے مدینہ ہی بہتر ہے، اگر وہ سمجھیں، اور اگر اشرفیوں کا خیال ہو تو وہ اب تک جیسی کی تیسی رکھی ہوئی ہیں (تذکرہ ۱/۱۹٦)۔

۱۱- مہدی کا بیٹا خلیفہ ہارون رشید خود امام مالک کے گھر پر حاضر ہوا، شہزادے بھی ساتھ تھے، امام سے درخواست کی کہ میرے لڑکوں کو اپنی کتاب مؤطا اپنی زبان سے سنا دیجیے، امام نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں نے ایک مدت سے کسی کو پڑھ کر نہیں سنایا ہے، لوگ خود پڑھ کر مجھے سناتے ہیں، ہارون نے کہا: اچھا اور لوگوں کو ہٹا کر تخلیہ کرا دیجیے تو میں خود پڑھ کر آپ کو سناؤں، امام نے فرمایا کہ جب کسی خاص شخص کی وجہ سے عام لوگوں کو علم سے محروم رکھا جاتا ہے، تو خاص کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچتا، اس کے بعد امام نے معن بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ تم پڑھو اور بادشاہ مع شاہزادوں کے سنے (تذکرہ ۱/۱۹۷)۔

۱۲- ہارون الرشید بغداد سے حج کے لیے روانہ ہوا، تو کوفہ میں پہنچ کر عبد اللہ بن ادریس اور عیسیٰ بن یونس کے پاس آدمی بھیجے کہ ہمارے پاس آکر حدیثیں بیان کر جائیے، دونوں نے آنے سے انکار کر دیا، مجبوراً امین و مامون دونوں شاہزادے ابن ادریس کے پاس خود گئے اور ان سے حدیث بیان کرنے کی درخواست کی، ابن

ادریس نے قبول فرمالیا، اور سو حدیثیں ان کو سنائیں، جب بیان کر چکے تو مامون نے عرض کیا کہ چچا! اجازت ہو تو میں اپنی یاد سے آپ کے سامنے ابھی ان حدیثوں کو دہرا دوں، ابن ادریس نے اجازت دی، اور مامون نے سب حدیثیں سنا دیں، ابن ادریس کو مامون کے حافظہ پر بڑا تعجب ہوا، یہاں سے اٹھ کر دونوں شاہزادے عیسیٰ بن یونس کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے حدیث سنانے کی درخواست کی، انھوں نے بھی منظور کر لیا اور حدیثیں سنائیں، اس کے بعد مامون نے دس ہزار اشرفیاں (یا درم) نذرانہ کے طور پر پیش کیے، مگر ابن یونس نے قبول نہ کیا، اور فرمایا کہ ایک چلو پانی تک تمھارا پی ہی نہیں سکتا (تذکرہ ۱/۲۵۹)۔

۱۳- محدثین کو بادشاہوں کے تقرب سے اتنی نفرت تھی کہ ابن ادریس کے نام ہارون الرشید کا ایک فرمان آیا، ابھی اتنا ہی پڑھا گیا تھا کہ ''خدا کے بندہ ہارون کی طرف سے عبداللہ بن ادریس کے نام''، کہ ابن ادریس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے اور ظہر کے بعد سے مغرب کے وقت تک بے ہوش رہے، مغرب سے ذرا پہلے پانی کا چھینٹا دیا گیا تو ہوش آیا، ہوش میں آنے کے بعد فرمایا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون، ہارون بھی مجھے جاننے لگا، خدا جانے مجھ سے کونسا گناہ صادر ہوا، کہ اس نے میرے پاس خط لکھا (تذکرہ ۱/۲۶۱)۔

۱۴- وکیع کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہارون کا ارادہ ہوا کہ ابن ادریس کو قاضی مقرر کرے، مگر انھوں نے سختی سے انکار کر دیا، ہارون نے ان کو بلا کر اس کے لیے ان سے گفتگو کی، تو انھوں نے کہہ دیا کہ میں اس کام کے لائق نہیں ہوں، ہارون نے خفا ہو کر کہا کہ میں تمھاری صورت نہ دیکھے ہوتا تو اچھا تھا، ابن ادریس نے کہا کہ میری بھی یہی تمنا تھی کہ تمھاری صورت نہ دیکھتا، یہ کہہ کر چلے آئے (تذکرہ ۱/۲۶۱)

ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی

مئو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

تمہید

مجھے اپنے ایک فاضل دوست کے توسط سے منکرین حدیث کے ایک رسالہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، جس کا عنوان ہے: ''میں منکرِ حدیث کیوں ہوا''۔ اس رسالہ میں کسی ''حق گو'' صاحب نے انکارِ حدیث کے وجوہ بیان فرمائے ہیں، اور رواۃ حدیث اور مصنفین کتب حدیث پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بہت زیادہ غلط بیانی سے کام لیا ہے اور نہایت نامعقول اور گمراہ کن طریقہ سے عوام کو حدیثوں سے بدظن کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ رسالہ مذکورہ پر ایک تبصرہ لکھ کر ''حق گو'' صاحب کی غلط بیانیوں اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کر دیا جاتا، میں خدائے علیم و قدیر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے اس ناتواں بندہ کو اس خدمت کی توفیق بخشی۔ فتقبلها الله منى كما وفقنى لها.

''حق گو'' کے رسالہ پر اجمالی تبصرہ

میں سمجھتا ہوں کہ رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پہلے حدیث کی حیثیت اور اس کی حجیت پر قرآن کریم سے روشنی ڈال دی جائے، تو رسالہ مذکورہ اور منکرین حدیث کے دوسرے تمام رسائل پر یہ ایک اجمالی تبصرہ اور ان کا اصولی رد ہو جائے گا، اس لیے پہلے اسی چیز کو پیش کرتا ہوں۔

قرآن کریم اور حدیث

قرآن کریم دنیا میں خدا کی آخری کتاب ہے، اور تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہ کتاب آسمانی دوسری تمام الہامی کتابوں سے بہت زیادہ جامع، مکمل اور مفصل ہے، اس میں عبادات و اخلاق، معاشرت و معاملات، سیاست و اقتصاد، معاش و معاد ہر چیز کا بیان ہے، لیکن یہ بھی بالکل بدیہی ہے، کہ امور متذکرۂ بالا کا بیان قرآن کریم میں کلی اور اصولی طور پر ہے، اور یہی ہونا بھی چاہئے، اس لیے کہ اولاً تو امور مذکورہ کی جملہ جزئیات کا فرداً فرداً تفصیلی بیان قرآن کریم کے برابر محدود و متناہی کتاب میں ممکن ہی نہیں۔ ثانیاً ایسے تفصیلی بیان کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، ہر آدمی جس کو علم سے کچھ تعلق ہے، یہ جانتا ہے کہ دنیا کے جملہ علوم و فنون کی کتابوں میں صرف اصولی مسائل اور قوانینِ کلیہ اور قواعد و ضوابط کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے، اور مصنفین کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ طالب علم استاذ کی مدد سے ان کلیات کا علم اس طرح حاصل کرے کہ جزئیات کے احکام و حالات ان ہی کلیات سے معلوم کر سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلم قرآن تھے ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اللہ رب العزت نے دنیا کی ہدایت کے لیے قرآن کریم کو اکیلا نہیں بھیجا تھا، اور قرآن کے ذریعے اصلاح و

ہدایت کی یہ شکل اختیار نہیں کی تھی کہ اس کو کتابی شکل میں بھیج کو لوگوں سے کہہ دیا ہو کہ اس کتاب کو ہر شخص بطور خود پڑھ پڑھ کر اس پر عمل پیرا ہو جائے، بلکہ قرآن سے پہلے اپنے ایک برگزیدہ رسول ﷺ کو بھیج کر ان ہی کے سینہ معارف گنجینہ میں قرآن نازل کیا اور آپ کو مکلّف فرمایا کہ:

۱- آپ لوگوں کو قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔

۲- اور اس کتاب کا درس و تعلیم بھی دیں، اور اس کے رموز و اسرار لوگوں پر کھول دیں۔

قرآن کریم نے کئی مقامات میں اس کی تصریح کی ہے:

۱- کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم ایتنا و یُزکیکم و یعلمکم الکتاب و الحکمۃ و یعلمکم ما لم تکونوا تعلمون (بقرہ پ ۲)

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے کہ پڑھتا ہے تم پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب و حکمت اور سکھاتا ہے تم کو وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔

۲- لقد مَنَّ اللّٰہ علی المومنین اِذ بَعَث فیھم رسولاً من انفُسِھم یتلوا علیھم ایتہٖ و یزکیھم و یعلمھم الکتٰب و الحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین (آل عمران پ ۴)

بہ تحقیق احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جبکہ بھیجا ان میں ایک رسول ان ہی میں سے کہ تلاوت کرتا ہے ان پر ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم کرتا ہے ان کو کتاب و حکمت، بالیقین تھے وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔

۳- ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایتہٖ و

(وہی) وہ ذات ہے جس نے بھیجا اَن پڑھوں میں ایک رسول ان ہی میں سے

یزکیھم و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (جمعہ پ ۲۸)

کہ تلاوت کرتا ہے ان پر ہماری آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے، بالیقین وہ تھے اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔

ان آیات میں بکرّات ومرّات تصریح کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف یہی نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیتیں لوگوں کو سنا دیتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم اور درس قرآن بھی ان کے فرائضِ رسالت میں سے ایک اہم فریضہ ہے، درحقیقت ان آیات میں خدائے تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ہم نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور انھوں نے عرب میں جیسا رسول بھیجنے کی درخواست کی تھی، بعینہ ان ہی اوصاف کا جامع اور ان ہی خصوصیات کا حامل رسول ہم نے ان میں مبعوث کیا، حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی یہ دعا خود قرآن مجید میں بایں الفاظ منقول ہے:

ربنا و ابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایتك و یعلمھم الکتب و الحکمۃ و یزکیھم انك انت العزیز الحکیم (بقرہ پ ۱)

اے ہمارے مالک! اور بھیج ان میں ایک رسول ان ہی میں سے کہ تلاوت کرے ان پر تیری آیتیں اور سکھائے ان کو کتاب وحکمت اور پاک کرے ان کو، بیشک تو ہی غالب (اور) حکمت والا ہے۔

تعلیم کتاب کا مطلب اب غور طلب امر یہ ہے کہ تلاوتِ آیات کے بعد تعلیمِ کتاب وحکمت سے کیا مراد ہے؟ آیا کتاب اللہ کا لفظی ترجمہ اور لغوی مفہوم بتانا، یا اس کے معانی ومطالب، اسرار وحکم اور وہ فروع وجزئیات جو اس سے مستنبط ہوتے ہیں، ان سے لوگوں کو آشنا کرنا، ظاہر ہے کہ پہلی صورت تو قطعاً مراد نہیں ہے، اس لیے کہ

عرب جن میں آپ مبعوث ہوئے تھے، اور جو عہد نبوی میں قرآن کے مخاطب اول تھے، وہ اس تعلیم سے بے نیاز تھے، قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اور یہ زبان ان لوگوں کی اپنی مادری زبان تھی، لہذا قرآن کا لفظی ترجمہ اور مفہوم لغوی ان کو معلوم کرانا بے ضرورت تھا، پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ تعلیم کی دوسری ہی صورت مراد ہے، چنانچہ قرآن کریم نے اسی مضمون کو ذیل کی آیتوں میں بیان کیا ہے:

۱- و ما انزلنا علیك الكتاب الا لِتُبَيِّنَ لهم (پ ۱۴ ع ۱۳)	اور نہیں نازل کی ہم نے کتاب مگر اس لیے کہ آپ بیان کریں ان لوگوں کے لیے۔
۲- و نـزّلنا اليك الذِّكرَ لِتُبَيِّنَ لِلنّاس ما نُزِّل اليهم و لعلّهم يتفكّرون (پ ۱۴ ع ۱۱)	اور نازل کیا ہم نے آپ کے پاس ذکر (کتاب) کو تا کہ کھول کھول کر بیان کریں لوگوں کے واسطے اس چیز کو جو نازل کی گئی ان کی طرف اور تا کہ وہ غور وفکر کریں۔

اور اس تعلیم و تبیین کی ضرورت اسی لیے پیش آئی کہ قرآن کریم میں عبادات و معاملات اور اخلاق و معاشرت وغیرہ کے صرف اصول اور کلی قوانین مذکور ہیں، اور ان اصول و کلیات سے ان کے فروع و جزئیات کا استنباط و استخراج ہر شخص کے لیے ممکن نہ تھا، بلکہ بعض جزئیات تک تو کسی شخص کی بھی رسائی ممکن نہ تھی، بجز اس ذات مقدس کے جس کا سینہ انوار وحی کا مخزن اور جس کا قلب تجلیات ربانی کی منزل ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص فہم قرآن میرے اس بیان میں اس شخص کو تو کوئی شک نہیں ہوسکتا، جس کا دل مرتبۂ رسالت کی عظمت و جلالت کے اعتقاد سے لبریز ہے، لیکن جو شخص اس ایمانی کیفیت سے نا آشنا ہو، میں اس سے کہتا ہوں کہ یہ تو بالکل بدیہی ہے کہ قرآن کریم کا کچھ نہ کچھ فہم تو ہر اس شخص کو عطا ہوا ہے، جو عربی زبان کا حرف شناس ہے، اور یہ بھی بدیہی ہے کہ اس فہم کے مراتب و درجات متفاوت و مختلف

ہیں۔ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ ایک آیت کو ہم بار بار پڑھتے ہیں اور سیکڑوں دفعہ ہماری نظر سے گذرتی ہے، اور اس سے کسی خاص نکتہ کی طرف ہمارے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی، لیکن ایک دوسرا شخص بیک نظر اس سے کوئی بہت نفیس علمی نکتہ اخذ کر لیتا ہے۔ پس جب ایک امتی کو دوسرے امتی پر فہمِ قرآنی میں یہ تفوق حاصل ہو سکتا ہے اور حاصل ہے، تو کیا خود اس کو جس کے قلب پر قرآن نازل ہوا، اور جس کا سینہ بالقائے ربانی اس وحیِ آسمانی سے معمور ہوا، اس کو سب امتیوں پر فہمِ قرآن میں کوئی تفوق و امتیاز خاص حاصل نہ ہوگا؟ میں تو یہی کہوں گا کہ کوئی مسلمان اس کا جواب نفی میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتا، اور کیسے جرأت کر سکتا ہے جب کہ قرآن کریم خود ہی بتا رہا ہے کہ اس کے معلم ﷺ کو منجانب اللہ فہم قرآن کے بارے میں ایک خاص بصیرت اور سوجھ عطا کی گئی تھی، جس کی بنا پر آپ کو لوگوں کے درمیان حکم مطلق کی حیثیت نوازش کی گئی تھی، خدا فرماتا ہے:

انا نزلنا اليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس بما اراك الله (نساء پ ۵)

بے شک ہم نے نازل کیا آپ پر کتاب کو تاکہ آپ فیصلہ کریں لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ کہ اللہ آپ کو دکھائے اور سوجھائے۔

یہ آیت صراحۃً بتا رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو کتاب اللہ کا خاص فہم اور خاص سوجھ اور سمجھ عطا کی گئی تھی، تاکہ آپ اس کے ذریعہ سے قرآنی احکام کے ماتحت لوگوں کے جھگڑے چکائیں اور فیصلے فرمائیں۔

فہم قرآن کے لیے شرح رسول کی روشنی درکار ہے ان بیانات سے خوب واضح ہو گیا کہ آنحضرت ﷺ قرآن کریم کے معلم اور شارح و مبین تھے، اور آپ کی شرح و تبیین اور تعلیم اس بصیرت کی روشنی میں ہوتی تھی، جو خاص آپ کو منجانب اللہ عطا

ہوئی تھی، اور چونکہ: ع

ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند

یعنی یہ بصیرت خاصہ آپ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، اس لیے ہر امتی کو قرآن کریم کے باریک معانی، دقیق مطالب اور اس کے غوامض و دقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لیے حضرت شارح قرآن علیہ السلام کی شرح وتبیین کی روشنی درکار ہوگی، چنانچہ خدا نے اس کو بھی قرآن کریم میں بیان کیا:

قد جاء کم من اللہ نور و کتاب مبین (پ ٦ ع ٦) بہ تحقیق تمھارے پاس اللہ کی جانب سے ایک نور (مجسم) اور ایک روشن کتاب آئی۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے کتاب مبین سے پہلے ایک نور کا ذکر فرمایا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب مبین کے معانی و مطالب تک رسائی بدون اس نور خاص کے ممکن نہیں، اور ہر وہ شخص جو کتاب مبین کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور اس پر عمل کرنے کا شوق رکھتا ہے، اس کو اس نور کی روشنی میں کتاب اللہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اور ظاہر ہے کہ یہ نور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے عبارت ہے، پس ثابت ہوگیا کہ کتاب اللہ کی مراد سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں آنحضرت ﷺ کی قولی و عملی شرح سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا، بلکہ بغیر اس کے یہ دونوں باتیں ممکن ہی نہیں۔

آنحضرت ﷺ کی شرح قرآن ہی کا نام حدیث وسنت ہے جب یہ بات بخوبی ذہن نشین ہوگئی، کہ قرآن کریم کے معلم وشارح علیہ السلام نے قرآن کریم کی جو شرح وتبیین فرمائی ہے وہ خدا کی دی ہوئی بصیرت اور روشنی میں کی ہے، اور صرف یہی نہیں کہ اس شرح سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں ہوسکتا، بلکہ اس سے بے نیازی برت کر کوئی مسلمان خود قرآن کریم پر عمل نہیں کرسکتا، اور نہ اس کے حقیقی مفہوم ومراد

تک رسائی حاصل کرسکتا ہے، تو اب یہ ماننے میں آپ کو کیا تامل ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ ساتھ اس کی وہ شرح وتبیین بھی جو اس کے شارح ومبین علیہ السلام نے فرمائی ہے، ہر مسلمان کے لیے واجب التسلیم ہے، اور قرآن کے بعد دین متین محمدی اور شریعتِ اسلامیہ کا وہ ستون ہے، جس پر یہ سر بفلک عمارت قائم ہے۔

قرآن کریم کی اسی شرح وتبیین اور قولی وعملی بیان کا نام حدیث وسنت ہے، اگرچہ مذکورۂ بالا بیان کے بعد کسی طالبِ حق کو حدیث وسنت کے واجب التسلیم ہونے میں شک وشبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، تاہم مزید اطمینان کے لیے اس مسئلہ پر قرآن کریم ہی سے مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حجیت حدیث کے اور دلائل قرآن کریم کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے، تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جس طرح آنحضرت ﷺ کی رسالت کی تصدیق اور آپ کی نبوت پر ایمان لانے کی پُر زور دعوت دی ہے، اسی طرح ایک اور بات کا بھی نہایت موکد حکم دیا ہے، اور اس کو کہیں "اطاعتِ رسول" کے عنوان سے ذکر کیا ہے، اور کہیں اس کی تعبیر رسول کو "حکم مطلق" ماننے سے کی ہے، پہلے مضمون کے لیے حسبِ ذیل آیتوں کو غور سے پڑھنا چاہئے:

۱- یٰایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا باللّٰہ و رسولہ و الکتاب الذی نزّل علیٰ رسولہ و الکتاب الذی اَنزل من قبلُ و من یکفر باللّٰہ و ملٰئِکتہ و کتبہ و رسلہ و الیوم الآخر فقد ضلّ ضلالا بعیدا۔	اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری، اور جو انکار کرے گا اللہ کا اور ملائکہ کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور پچھلے دن کا تو وہ دور کی گمراہی میں پڑ گیا۔
(پ ۵ ع ۱۶)	

٢-و الذين امنوا بالله و رسوله و لم يفرقوا بين احدٍ منهم اولئك سوف يوتيهم اجورهم (پ٦ ع١)	اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر اور ان کی کوئی تفریق نہ کی وہی لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ ان کو ان کے اجر دے گا۔
٣-يا ايها الناسُ قد جاء كم الرسول بالحق من ربكم فآمنوا خيراً لكم (پ٦ ع٣)	اے لوگو! بے شک تمھارے پاس حق کے ساتھ رسول آیا، پس ایمان لاؤ اسی میں تمھارے لیے بھلائی ہے۔
٤-انما المومنون الذين امنوا بالله و رسوله (الآية) [پ٢٦ ع١٣]	مومن بس وہی ہیں جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور اس کے رسول پر۔
٥-و من لم يومن بالله و رسوله فانا اعتدنا للكافرين سعيرا (پ٢٦ ع٩)	اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے، تو ہم نے منکروں کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔

اور دوسرے مضمون کے لیے آیات ذیل سامنے رکھنی چاہئیں:

١-يا ايها الذين آمنوا اطيعوا الله و اطيعوا الرسول و لا تبطلوا اعمالكم (پ٢٦ ع٧)	اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔
٢- و اطيعوا الله و رسوله ان كنتم مومنين (پ٩ ع١٥)	اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر تم ایمان والے ہو۔
٣-يا ايها الذين آمنوا اطيعوا الله و رسوله و لا تولوا عنه و انتم تسمعون (پ٩ ع١٦)	اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور منھ نہ پھیرو اس سے درانحالیکہ تم سنتے ہو۔

٤- و یطیعون اللّٰه و رسولَه (پ١ ع١٤)
اور وہ مومن اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔

٥- و اَطیعوا اللّٰه و اَطیعوا الرَّسولَ واحذَروا (پ٧ ع٢)
اور فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ڈرو اس کی مخالفت سے۔

٦- من یُّطِعِ الرسول فقد اَطاع اللّٰه (پ٥ ع٧)
جس نے حکم مانا رسول کا تو شبہ نہیں کہ اس نے اللہ کا حکم مانا۔

٧- و اِذا قیلَ لهم تعالَوا الی ما اَنزلَ اللّٰه و الی الرسول رأیتَ المنافقین یصدُّون عنك صدوداً (پ٥ ع٥)
اور جب کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جس کو خدا نے نازل کیا اور (آؤ) رسول کی طرف تو دیکھو گے (اے رسول) منافقوں کو کہ منھ پھیرتے ہیں تم سے منھ پھیرنا۔

٨- یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللّٰه و اطیعوا الرسول و اولی الأمر منکم فاِن تنازعتم فی شیء فرُدُّوه الی اللّٰه و الرسول (پ٥ ع٥)
اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور اپنے میں سے امر والوں کا پس اگر جھگڑو تم کسی بات میں، تو لوٹاؤ اس کو اللہ اور رسول کی طرف۔

٩- فلا و ربّك لا یومنون حتی یُحَکِّموكَ فیما شَجَر بینهم ثم لا یجدوا فی انفُسهم حرجاً مما قضیت و یُسلِّموا تسلیما (پ٥ ع٦)
پس قسم ہے آپ کے پروردگار کی کہ وہ مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ (اے رسول) ان کے آپس میں جو نزاع واقع ہو، اس میں آپ کو حکم نہ بنائیں، پھر نہ پائیں اپنے دلوں میں کوئی تنگی تمھارے فیصلہ سے اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔

۱۰- و ما کان لمومن و لا مومنۃٍ اِذا قضی اللّٰہ و رسولہ امراً اَن یکون لھم الخیرۃ من اَمرھم و من یعص اللّٰہ و رسولہ فقد ضلَّ ضلالًا مبینا (پ ۲۳ ع ۱)

کسی ایمان والے مرد یا عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی حکم دیدیں تو ان کو اپنے معاملہ کا اختیار باقی رہے، اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ بےشبہہ کھلا گمراہ ہوگیا۔

دونوں قسم کی آیتیں آپ کے سامنے ہیں، پہلی قسم کی آیتوں میں جس طرح خدا، ملائکہ، کتاب اللہ اور قیامت پر ایمان لانے کا حکم ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی تاکید ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اعتقاد اور آپؐ کے مبعوث من جانب اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور دوسری قسم میں اس کے سوا ایک دوسری بات کا حکم ہے، اور وہ یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اسی طرح رسول کی فرمانبرداری اور آپ کے احکام کی تعمیل بھی ضروری ہے، یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کتاب اللہ میں مذکور ہیں، لہذا اس کی اطاعت وفرمانبرداری سے مراد یہ ہے کہ اس کی کتاب کو دستور العمل بنایا جائے، لیکن غور طلب یہ چیز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری اور اس کے احکام کی تعمیل سے کیا مراد ہے؟ اگر کہیئے کہ وہی کتاب اللہ کی پیروی، تو میں کہوں گا کہ یہ بات تو پہلے فقرہ میں آچکی ہے، لہذا ایک ہی بات کو دو عنوانوں سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر یہ ایک ہی جگہ نہیں، بلکہ مذکورۂ بالا سب آیتوں میں ان کے سوا دوسری صدہا آیتوں میں بھی یونہی ہے، تو کیا ہر جگہ یہی کہہ دیا جائے گا کہ دوسرے فقرے میں بھی پہلی ہی بات دہرادی گئی ہے، قرآن کریم کے معجزانہ ایجاز کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو کوئی صاحب عقل یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

اور اگر یہ تاویل بارد "اطیعوا اللہ و رسولہ" یا اس قسم کی دوسری آیتوں میں چل بھی جائے تو آیت نمبر ۹ میں کیا تاویل کی جائے گی؟ اس میں تو "اطیعوا اللہ" کا فقرہ موجود ہی نہیں، بلکہ اس میں تو اتنا مذکور ہے، کہ کوئی اس وقت تک مومن ہی نہیں ہوسکتا، جب تک اپنے جملہ نزاعات اور اپنے تمام اختلافات میں نبی عربی ﷺ کو ایسا حَکَم اور فیصلہ کُن نہ قرار دے کہ آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے، بتائیے! کیا یہاں بھی یہی کہیے گا کہ آنحضرت ﷺ کو حَکَم ماننے سے مراد کتاب اللہ کو ماننا ہے؟

اگر کوئی صاحب یہ جرأت کرنے کے لیے آمادہ ہوں تو بتائیں کہ اس کے لیے ان کے پاس کون سی دلیل ہے؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ اگر یہی مراد تھی تو یحکموک کی بجائے یحکموا کتاب اللہ کہنے میں کیا نقصان تھا؟

بہر حال آیات مذکورۃ الصدر سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی فرمانبرداری اور کتاب اللہ کی پیروی کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری اور احکام رسول (ﷺ) کی تعمیل بھی ضروری ہے، اور یہ کہ رسول (ﷺ) کو اپنے ہر اختلاف میں حَکَم مطلق ماننا مدارِ ایمان ہے، اور ہم احکام رسول ﷺ اور آپ کے فیصلوں ہی کو "حدیث" کہتے ہیں، پس حدیثِ رسول ﷺ کے واجب التسلیم ہونے میں اب کون سا شبہہ باقی رہ گیا؟

کیا آنحضرت ﷺ کے بست و سہ سالہ عہدِ رسالت میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا؟ کیا اس طویل مدت میں آپ کے روبرو کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا؟ اگر ہوا (اور بہت ہوا) تو بتایا جائے کہ ان اختلافات و مقدمات میں جو فیصلے دربارِ رسالت سے صادر ہوئے، ان کا کیا نام ہے؟ اور وہ کہاں ہیں؟

اگر کوئی بدبخت یہ کہے کہ وہ سارے فیصلے مسلمانوں کی بے اعتنائی سے نذرِ

حوادث ہو گئے، اور آنحضرت ﷺ کا ایک فیصلہ بھی دست بُردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا، تو یہ اسلام کی تاریخ پر نہایت ناپاک حملہ ہے، اور ایسا شخص مسلمانوں کا بدترین دشمن ہے۔

رسول علیہ السلام کی حرام کی ہوئی اشیاء بھی اسی طرح حرام ہیں، جس طرح خدا کی حرام کی ہوئی

اس کے بعد قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف بھی میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں جو چیزیں حرام کی ہیں، ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ نے حرام کیا ہے، اور ان چیزوں کو حرام سمجھنا اور ان کے استعمال سے بچنا اسی طرح ضروری اور واجب ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی اشیا سے، ارشاد ہوتا ہے:

قاتلوا الذین لا یومنون باللّٰہ و لا بالیوم الآخر و لا یحرّمون ما حرّم اللّٰہُ و رسولُہ (پ ۱۰ ع ۱۰)	لڑو اُن لوگوں سے جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور ان چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے، حرام نہیں قرار دیتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حرام کی ہوئی چیزیں کون کون سی ہیں اور ان کے معلوم کرنے کے ذرائع کیا ہیں؟

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں بجز اس کے جس کو ہم ''حدیث'' کہتے ہیں اور کہیں سے معلوم نہیں ہوسکتیں، پس معلوم ہوا کہ احادیث میں جن اشیاء کی حرمت مذکور ہے، ان کو حرام نہ سمجھنا بلکہ پورے ذخیرۂ احادیث کو بے کار و موضوع اور بناوٹی کہنا در حقیقت اس آیت اور آیاتِ سابقہ کا انکار کر دینا ہے۔

اس مقام پر میں آپ کو ابوداود و ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کر دینا مناسب

سمجھتا ہوں، جس کو اس آیت کی شرح کہنا بے جا نہ ہوگا، اس حدیث کے پڑھنے کے بعد علماء محققین کی اس تحقیق کی صداقت آئینہ ہو جائے گی، کہ احادیثِ نبویہ در حقیقت قرآنِ کریم کی شرحیں ہیں، اور اس سے ماخوذ و مستنبط ہیں، وہ حدیث یہ ہے:

یُوشِکُ الرَّجُلُ مُتَّکِئاً علی اریکَتِہٖ یُحدّثُ بحدیثٍ مِن حدیثي فیقولُ بیننا و بینکم کتاب اللہ فما وجدنا فیہ من حلالٍ استحللناہ و ما وجدنا فیہ من حرامٍ حرَّمناہ ألا و انَّ ما حرَّم رسولُ اللہ مثل ما حرَّم اللہ.	وہ زمانہ قریب ہے جب کہ ایک آدمی اپنے تخت پر بیٹھا ہوگا، اور اس سے میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی، تو وہ کہے گا کہ ہمارے تمھارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے، اس میں جو حلال ہو، ہم اس کو حلال سمجھیں گے اور جو حرام ہو اس کو حرام، لیکن تم آگاہ رہو کہ جن اشیاء کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام کیا، وہ بھی ان ہی کی طرح ہیں جن کو اللہ نے حرام کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحلیل و تحریم کا ذکر قرآن کی دوسری آیت میں

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحلیل و تحریم دونوں کا ذکر موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان دونوں امور میں آپ کے اتباع کی دعوت کے علاوہ اس ذکر کا اور کوئی مقصود نہیں ہوسکتا، ارشاد ہے:

و یحلُّ لَھمُ الطَّیِّباتِ و یُحرِّمُ علیھمُ الخبائثَ و یَضَعُ عنھم اِصْرھم و الأغلالَ الّتی کانت علیھم (پ ۹ ع ۹)	اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) امی لوگوں کے لیے پاکیزہ اشیاء کو حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں اور ان سے اس بوجھ اور ان پھانسیوں کو جو ان پر پہلے تھیں اتارتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی پیروی کا حکم بھی قرآن نے دیا ہے

اقوال تو اقوال قرآن کریم نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کی

پیروی کرنے کی بھی دعوت دی ہے، ارشاد ہوا:

لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ (یعنی) تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات مقدس میں بہتر پیروی کی باتیں ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے ان ہی اعمال اور افعال کو جن کی پیروی کا حکم آیات بالا میں ہے، ہم ''سنت'' کہتے ہیں، اس پورے بیان کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے علاوہ آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال بھی قابلِ عمل واجب التسلیم اور حجت ہیں، اس مضمون کو خود قرآن کریم نے مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے، ساڑھے تیرہ سو برس سے تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ، یہی خیال اور بالاتفاق سب کا اسی پر عمل تھا اور ہے۔

انکارِ حدیث لیکن چند دنوں سے ہندوستان میں کچھ افراد ایسے پیدا ہو گئے ہیں، جو مسلمانوں کے اس قدیم اجماعی عقیدے کو غلط اور افعال و اقوالِ نبوی ﷺ کی پابندی کو غیر ضروری بتاتے ہیں، اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان علمی ذخیروں کو جو اقوال و افعالِ نبوی ﷺ پر حاوی ہیں، مفتریات کی پوٹ اور مصنوعی و خود تراشیدہ افسانوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، اور بالکل صاف صاف یہ کہ احادیثِ نبویہ کے قابلِ عمل و لائقِ اعتبار ہونے سے انکار کرتے ہیں، جہاں تک غور کیا گیا، لامذہبیت کے سوا اور کوئی علت انکارِ حدیث کی معلوم نہیں ہوتی، اس کا راز صرف یہ ہے کہ انکارِ حدیث کے بعد ان کی ملحدانہ تگ و دو کے لیے میدان نہایت وسیع اور ہموار ہو جائے گا، مذہبی پابندیاں یکسر نیست و نابود ہو جائیں گی، یا بدرجۂ اقل صرف نام کو رہ جائیں گی، ایک قرآن رہ جائے گا، اس کے معنی و مفہوم میں اپنی رائے و قیاس سے جو تصرف و تحریف کرنا چاہیں گے، پوری آزادی سے کر سکیں گے، اگر کسی نے ٹوکا کہ یہ مفہوم احادیث یا تفاسیر کے خلاف ہے، تو نہایت صفائی سے کہہ دیا جائے گا، کہ وہ مفہوم اگر راوی اور مفسر نے اپنی سمجھ سے بیان کیا ہے تو ہم اس کے پابند نہیں، اور اگر حدیث نبوی ﷺ کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے، تو حدیث

قابلِ اعتبار و استناد نہیں ہے، چلئے قصہ ختم ہوا، اب جس آیت کا جو مفہوم چاہیے قرار دے لیجئے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، یہ خیالات نہیں ہیں، بلکہ واقعات ہیں، منکرینِ حدیث کے جس مضمون یا رسالہ میں چاہیں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں، ایسی بعض مثالیں میں آگے ذکر بھی کروں گا؟

میں نے منکرینِ حدیث کے انکار کی جو علت ذکر کی ہے، حقیقی علت تو وہی ہے، لیکن اس علت کے اظہار کے بعد کون بے خرد مسلمان ہوگا، جو ایک لمحہ کے لیے بھی ان کی خرافات کو سن سکے اور ان کے دامِ فریب میں آسکے، اس لیے اس پر پردہ ڈالنے کے لیے دوسری دوراز کار علتیں تراشی جاتی ہیں، اور اگرچہ ان علتوں کی سخافت و کمزوری بھی بہت کھلی ہوئی ہے، تاہم بعض ناواقف مسلمان منکرینِ حدیث کے ملمع کارانہ بیان سے دھوکے میں آجاتے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر کچھ ان کی نسبت بھی لکھ دوں۔

منکرینِ حدیث کے وسوسوں کا دفعیہ انکارِ حدیث کی جو علتیں ذکر کی جاتی ہیں، یا کی جاسکتی ہیں، ان کو علت کہنا علت کی توہین ہے، اس لیے میں بجائے علت کہنے کے وسوسہ سے تعبیر کرتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ حسبِ ذیل وسوسے انکارِ حدیث کے باعث بن سکتے ہیں:

پہلا وسوسہ اقوال و افعالِ نبوی ﷺ کی پیروی کا خدا نے حکم ہی نہیں دیا، اس کا تفصیلی رد آپ سن چکے اور معلوم کر چکے کہ اقوال و افعالِ نبویؐ کے واجب التسلیم قابلِ پیروی ہونے کا منکر قرآن کی صدہا آیات کا منکر ہے۔

دوسرا وسوسہ اقوال و افعالِ نبوی ﷺ قابلِ پیروی تو ہیں، لیکن ان کا کہیں وجود نہیں ہے، مسلمانوں کی بے اعتنائی سے ایک قول یا ایک فعل کی نقل و حکایت بھی محفوظ

نہ رہی، مسلمانوں نے اس کی نقل و حکایت کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی بدیہی و متواتر بات کا انکار جس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے، محل تعجب ہے، یہ بات تواتر کے اعلیٰ درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ جو مسلمان آنحضرت ﷺ کی صحبت سے شرف اندوز ہوئے، انھوں نے آپ کے جملہ اقوال و افعال کی حفاظت کا ایسا اہتمام کیا، جس کی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کرسکتی، زبانی یاد داشت کے علاوہ تحریری یادداشت کا بھی انتظام کیا، جیسا کہ مقدمہ میں پورے شرح و بسط کے ساتھ بتایا جا چکا ہے، پھر اس امانت کو پورے احتیاط کے ساتھ انھوں نے تابعین کے حوالہ کیا، اور تابعین نے اس کو تبع تابعین تک پہنچایا، اس عہد میں زبانی روایات کا سلسلہ تو جاری ہی رہا، تصنیف و تالیف بھی شروع ہوگئی، چنانچہ اس عہد کا ایک مجموعۂ اقوال و افعالِ نبویؐ آج بھی دنیا کے ہر گوشہ میں موطا کے نام سے موجود ہے، اور اس کے بعد تو بکثرت ایسے مجموعے تیار ہوئے، جس کو مسلمانوں نے اصولی طور پر بلا ردوقدح قبول کیا، اور آج تک برابر قبول کرتے آئے، چنانچہ یہ مجموعے آج بھی نہایت کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ تو کیا ان کے وجود سے انکار کردینا آفتاب کے وجود سے انکار کے مرادف نہیں ہے؟

غیر مسلموں کی شہادتیں میں نہیں سمجھتا کہ یہ منکرین ایسی متواتر چیز کا کس طرح انکار کرسکتے ہیں، جس کا اعتراف متعصب یورپین مصنفین کو بھی ہے، حالانکہ منکرین ان کی کسی بات کو وحی سے کم تصور نہیں کرتے، منکرین کو سوچنا چاہئے کہ صرف مسلمان ہی اس کے قائل نہیں ہیں کہ اقوال و افعالِ نبوی محفوظ ہیں، بلکہ غیر مسلم مورخین بھی اس کے مقر و معترف ہیں، چنانچہ مشہور روسی فیلسوف ٹالسٹائی نے آنحضرت ﷺ کے چند حکیمانہ اقوال زریں کا ترجمہ روسی زبان میں شائع کیا ہے، اور مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے تاریخِ زوالِ روم جلد ۵ باب ۵۰ میں لکھا ہے:

"ہر ایک بانی مذہب کی سیرت سے اس کے تحریری مکاشفات کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ (حضرت) محمد (ﷺ) کی حدیثیں امر حق کی جامع نصیحتیں اور ان کے افعال مجسم نیکی کے نمونے ہیں"۔

اگر اقوال و افعال نبویہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کا کوئی ذریعہ علم دنیا میں موجود نہیں تو ٹالسٹائی کس کے اقوال کا ترجمہ شائع کرتا ہے، اور گبن کس کے اقوال و افعال کو جامع نصیحت اور مجسم نیکی کا نمونہ بتا رہا ہے۔

مسلمانوں کا ناز خاک میں مل جائے گا مسلمانوں کو تمام دنیا کے مقابلہ میں ناز اور بجا ناز تھا، کہ اسلام کی تاریخ سے زیادہ مکمل تاریخ کسی مذہب کی نہیں ہے، اور داعی اسلام کے حالاتِ زندگی ان کے افعال و اقوال وغیرہ جتنی تفصیل و تکمیل کے ساتھ مسلمان پیش کر سکتے ہیں، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اپنے داعی کی نسبت اس کا ہزارواں حصہ بھی پیش کرنے سے عاجز ہے، مسلمانوں کے پاس ان کے رسول ﷺ کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ اور جزئی سے جزئی حالت کی نہایت مستند نقل موجود ہے، مسلمانوں کے پاس ان کے نبی ﷺ کی خوراک و پوشاک، نشست و برخاست، نقل و حرکت، غرض ہر چیز کا بیان موجود ہے، لیکن منکرینِ حدیث نے حدیث کا انکار کر کے مسلمانوں کا یہ فخر و ناز بھی خاک میں ملا دیا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اگست ۱۹۲۹ء کے معارف میں بہت خوب لکھا ہے کہ:

"اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے رسول ﷺ کے ایک ایک واقعہ، ایک ایک قول اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا اور ان کے لیے متعدد اصول اور فن ایجاد کیے، مگر اگر اسلام کے ان نئے محسنوں (یعنی منکرین حدیث) کے خیالات مان لیے جائیں، تو یہ کارنامہ اسلام

اور مسلمانوں کے لیے لعنت بن جائے گا، اور صحابہؓ سے لے کر آج تک وہ تمام اخیار واکابرِ امت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے، وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے، کیا یہ اسلام پر احسان ہے؟ آنحضرت ﷺ کے بعد سے لے کر آج تک خلفاء راشدین، تابعین، ائمہ مجتہدین، علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور اقوالِ نبوی کی تقلید واتباع کرتے رہے ہیں، لیکن آج سے یہ لازم آئے گا، کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک، انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے، اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں، ان کے اقوال و اجتہادات و استنباطات کے سننے والے سچے موحد، سچے دیندار اور کتاب اللہ کے سچے پیرو ثابت ہوں، اس کے بعد یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کا مشن سخت ناکام رہا، اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین اسرار پیدا ہوئے ہیں، اور انھوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا کیا، اور وہ کام کیا، جو نہ خود رسول (ﷺ) نے، نہ ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے کیا، نہ عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) نے کیا، نہ علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہ) نے کیا، نہ دوسرے صحابہؓ اور تابعینؒ نے کیا، اور نہ دوسرے ائمۂ مجتہدین سے ہو سکا، پھر ہمیں کوئی بتائے کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی یا نہیں، اگر تھی تو وہ کب؟ اور اس کی تاریخ کہاں ملے گی؟ اور اگر نہ تھی، تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفہ آسمانی دنیا میں اور کون ہوگا، کیا کسی مسلمان کی غیرتِ اسلامی اس خیال کو جائز رکھتی ہے؟''

مسلمانانِ سلف پر سخت حملہ اگر احادیث کا یہ سارا ذخیرہ بے اعتبار، مصنوعی اور بناوٹی ہے، تو میں منکرین حدیث سے پوچھتا ہوں کہ کیا جس وقت امام مالکؒ نے مثلاً موطا میں بزعم منکرین حدیث رسول پاک ﷺ پر افترا پردازیاں کیں، اور رسولِ کریم ﷺ واصحابِ کرام رضی اللہ عنھم کی طرف جھوٹی جھوٹی باتیں منسوب کیں، اسلام کے عین مرکز میں اور اس سرزمین میں جہاں رسول کریم ﷺ آرام فرما ہیں، اور وہاں بھی خاص اس مسجد محترم میں جو دس برس تک درس گاہِ نبوت اور سجدہ گاہِ رسول خدا (ﷺ) رہ چکی تھی، امام مالکؒ نے ان مفتریات واکاذیب کے مجموعہ کا درس دینا شروع کیا، اور اس درس میں اندلس، مصر، شام، کوفہ، بصرہ اور بلادِ عجم تک کے علماء شریک ہوئے، اور اس مجموعہ کی روایت وسماع بلکہ ان کی نقلیں حاصل کر کے اطرافِ عالم میں پھیل گئے اور اس مجموعہ کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، تو اس وقت کوئی ہمدردِ اسلام، کوئی حقیقی مسلمان، بلکہ کوئی غیرتمند انسان ایسا نہ تھا، جو امام مالکؒ کی اس نازیبا کارروائی کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت کرتا، اور مسلمانوں کو ان کے فریب سے بچاتا، اور ان افترا پردازیوں کی روک تھام کرتا، درصورتیکہ یہ روک تھام اور افترا پردازیوں کی پردہ دری کچھ مشکل بھی نہ تھی، اس لیے کہ امام مالکؒ نے موطا میں جو روایتیں جمع کی ہیں، ان کی نسبت یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ انھوں نے ان کو فلاں فلاں علماء سے سنا ہے، اور تصنیف موطا کے وقت ان میں سے بہت سے علما بقیدِ حیات موجود تھے، لہٰذا امام مالکؒ کے خلاف ان علماء کی شہادتیں حاصل کر کے امام مالکؒ کی ''غلط بیانیوں'' کا راز نہایت آسانی سے فاش کیا جا سکتا تھا، لیکن کسی نے ایسا نہ کیا، ایک آواز بھی امام مالکؒ کی مخالفت میں نہ اٹھی، کسی عالم نے بھی ان کو افترا پرداز اور غلط گو نہ کہا، ممکن ہے منکرینِ حدیث بول اٹھیں کہ موطا کی تصنیف حکومت کی سرپرستی میں ہوئی ہے، اس لیے حکومت کے خوف سے کوئی نہیں بولا، لیکن یہ کہنا جہالت کا بدترین نمونہ ہوگا، اس

لیے کہ تاریخیں شاہد ہیں کہ اس زمانہ کے اہلِ علم حکومتوں کے خوف سے حق گوئی سے کبھی باز نہ رہتے تھے، امام احمدؒ بلکہ خود امام مالکؒ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ حکومت نے ان حضرات کے ساتھ انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا، مگر ان حضرات نے اپنی تحقیق کے خلاف لب نہ ہلایا، مہربانی فرما کر منکرینِ حدیث علماءِ سلف کو اپنے اوپر قیاس نہ کریں۔

علاوہ بریں یہ بالکل تاریخی بات ہے، اور تاریخوں میں بہ سرپرستی حکومت موطا کے تصنیف ہونے کا کوئی ضعیف سے ضعیف ثبوت بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ تصنیف موطا کے بعد بادشاہِ وقت نے امام مالکؒ سے درخواست کی، کہ آپ شاہی محل میں شاہزادوں کو موطا کا درس دے جایا کریں، تو امام مالکؒ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ جس کو علم کی طلب ہو، اس کو عالم کی خدمت میں خود حاضر ہونا چاہیے، اگر امام مالکؒ نے حکومت کی سرپرستی میں کتاب لکھی ہوتی، اور حکومت کی رضامندی ہی اس تصنیف کی غرض دغایت ہوتی، تو خود اپنی عقل سے سوچو کہ امام مالکؒ یہ جواب بادشاہِ وقت کو ہرگز نہیں دے سکتے تھے، امام مالکؒ سے پہلے حدیث کے جو مجموعے تیار ہوئے مثلاً ابن جریجؒ المتوفی ۱۵۰ھ اور ابن ابی عروبہؒ المتوفی ۱۵۶ھ اور ابن شہابؒ المتوفی ۱۲۴ھ نے حدیث کی جو کتابیں لکھی تھیں ان کے لکھنے کے وقت میں بھی کسی مسلمان نے ان کی کارروائیوں پر اظہارِ نفرت نہ کیا، نہ کسی نے ان کی مخالفت کی، حالانکہ ان کے وقت میں تو خود صحابہؓ کرام بھی موجود تھے، لیکن کیا منکرینِ حدیث کسی تاریخ سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ کسی صحابی نے ان کی تکذیب کی، ان کو مفتری کہا، اور ان کی غلط بیانیاں ظاہر کیں؟ اور اگر اس وقت نہیں تو کیا، اس کے بعد چودھویں صدی تک ان مصنفینِ حدیث کی افترا پردازیوں کی حقیقت جو اس صدی میں منکرینِ حدیث پر منکشف ہوئی، کسی اور مسلمان پر بھی منکشف ہوئی؟ اگر نہیں منکشف ہوئی، تو مسلمانوں

سے زیادہ گمراہ اور جاہل قوم دنیا میں کوئی نہ گزری ہوگی، کہ یہ قوم ساڑھے گیارہ سو برس تک ایک چیز کو اصولِ دین میں سے سمجھتی رہی، اور اس طویل مدت میں کسی کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا، استغفر اللہ! کون باحمیت مسلمان ہوگا، جو اس یاوہ گوئی کا تحمل کر سکے گا۔

منکرینِ حدیث کا یہ اقدام نہایت خطرناک ہے پھر میں ان منکرینِ حدیث سے پوچھتا ہوں، کہ اگر دوسری صدی کے نصفِ اول ہی میں (معاذ اللہ) مسلمانوں کی ''بے دینی'' و ''بے حمیتی'' اور ان کی ''ایمانی و اخلاقی کمزوری'' کا یہ حال ہو گیا تھا کہ رسولِ خدا ﷺ پر کچھ مسلمانوں نے افترا پردازیاں کیں، اور پے در پے کرتے رہے، اور مسلمانوں کو قرآن کریم اور اس کی تعلیمات سے بے توجہ، بے پروا، اور ناواقف بنانے کی تدبیریں عمل میں لاتے رہے، اور دینِ قیم میں ہزاروں لایعنی باتیں، ہزاروں خلافِ قرآن عقائد و اعمال، ہزاروں مخالفِ عقل و دور از کار افسانے داخل کرتے رہے، اور ذاتِ نبویؐ پر سینکڑوں ناجائز تہمتیں تراشتے رہے، اور سارے مسلمانانِ عالم ان شرمناک حرکات کا خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے، کسی نے ان ''مفتریوں'' کے مقابلہ میں اپنی ایمانی و اخلاقی جرأت سے کام نہ لیا، اور کوئی رسول اللہ ﷺ کی عزت اور ناموس کی حفاظت اور قرآن کریم کی حمایت کے لیے کھڑا نہیں ہوا، اور شریعت مطہرہ میں اس قدر تحریفات ہوتے دیکھ کر بھی کسی کی رگِ حمیت نہ پھڑکی، تو اگر کوئی غیر مسلم آپ سے پوچھے، کہ جب ان مسلمانوں کا یہی حال تھا، تو کیا اطمینان ہے کہ قرآن کریم ان کے ناروا تصرفات سے سالم رہا ہوگا، اور کیا توقع ہے کہ ان مسلمانوں نے اس کو بجنسہٖ محفوظ رکھنے کے لیے کوئی کوشش کی ہوگی؟ منکرینِ حدیث بتائیں کہ اس غیر مسلم کو وہ کیا جواب دیں گے؟

انکارِ حدیث کا لازمی نتیجہ انکارِ قرآن ہے منکرینِ حدیث خوب اچھی طرح غور کر لیں، کہ ایسی متواتر چیزوں کے انکار اور ایسے تواتر کو بے اعتبار کر دینے کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ ان کے ہاتھوں سے قرآن کریم، بلکہ خود رسولِ خدا ﷺ کا دامن بھی

چھوٹ جائے گا، اس لیے کہ ان سب چیزوں کے ثبوت کا مدار سوائے اخبار متواترہ کے اور کسی چیز پر نہیں ہے، میں ہر چند غور کرتا ہوں، لیکن کسی طرح یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرینِ حدیث کو عقل و خرد سے اتنی بیگانگی کیوں ہے؟ آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ کتب احادث میں جو اقوال و افعالِ نبوی آنحضرت ﷺ سے لے کر ان کتابوں کے مصنفین تک مسلسل راویوں کے بیان و شہادت کے ذریعہ منقول ہوتے ہیں، ان کو تو بے اعتبار و ناقابلِ قبول کہہ دیا جاتا ہے، لیکن کتب تاریخ میں جو واقعات و حالات مذکور ہیں، باوجودیکہ ان کی کوئی سند مذکور نہیں ہے، پھر بھی وہ سب مسلّم و مقبول ہیں: ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اور اس سے زیادہ بے خردی کا مظاہرہ یوں کیا جاتا ہے، کہ یورپ کا ایک دشمنِ اسلام مصنف آنحضرت ﷺ کے ایک ہزار سال بعد پیدا ہوتا ہے، اور محض اپنے قیاس و تخیل سے آنحضرت ﷺ یا قرآن یا اسلام یا حدیث یا کسی تاریخی واقعہ کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرتا ہے، تو ان مدعیانِ عقل کے نزدیک وہ ایسی یقینی بات ہو جاتی ہے کہ اس کو ''پیامِ جبرئیل'' سے کم نہیں سمجھتے، لیکن اخیارِ امت محمدیہ اور علماء سلف امور مذکورہ کے عینی شاہدوں کا بیان باسنادِ متصل پیش کریں تو اصلاً ناقابلِ التفات اور قطعاً غیر معتبر و ناقابلِ قبول: ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

تیسرا وسوسہ جو انکارِ حدیث کا حیلہ بن جاتا ہے، یہ ہے کہ حدیثوں میں بہت سی باتیں خلافِ عقل ہیں، اور خلافِ عقل باتیں قابلِ تسلیم نہیں ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انکارِ حدیث کی یہ سب سے بھونڈی وجہ ہے، منکرین حدیث کو اس وجہ کے ذکر کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ وہ عقل کا ایک خاص معیار پیش کرتے، اور اس معیار کا ثبوت قرآن کریم سے دیتے، یا کم از کم اس معیار پر تمام یا اکثر عقلاء کا اتفاق پیش کرتے، یا یہ بھی نہیں تو اس معیار پر کوئی ایسی عقلی دلیل قائم کرتے، جس سے

اکثر منصف مزاج لوگ مطمئن ہو جاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور نہ ایسا کوئی معیار پیش کرنا ان کے امکان میں ہے، ہر واقف کار جانتا ہے کہ دنیا میں کوئی معیارِ عقل چند دنوں سے زیادہ قائم نہ رہ سکا، فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدیدہ دونوں کی تاریخیں پڑھئے، تو معلوم ہو جائے گا کہ آج جو معیارِ عقل و دانش قرار دیا گیا، کل اس کو غلط اور لغو بتایا گیا، ابھی کل تک جو چیزیں ناممکن سمجھی جارہی تھیں، آج ہم ان کو اپنے مشاہدہ میں پاتے ہیں، علاوہ بریں میں منکرینِ حدیث سے پوچھتا ہوں کہ عقل کو معیارِ رد و قبول قرار دینے میں کیا صورت اختیار کرتے ہیں؟ اگر وہ کچھ خاص نوعیت کے اشخاص کی عقلوں کو معیار بتاتے ہیں، تو ان کو بتانا ہوگا، کہ کس نوعیت کے لوگوں کی عقلیں معیار ہوں گی، اور اس نوعیت کی تخصیص کا کیا ثبوت ہے؟ اور اس خاص نوعیت کے اشخاص کی تعیین و انتخاب میں اختلاف ہوگا، تو اس کا فیصلہ عقل سے ہوگا یا نقل سے؟ اگر عقل سے ہوگا، تو پھر وہی سوالات ہوں گے، اور اگر نقل سے ہوگا تو وہ نقل کیا ہے؟ اور اگر ہر شخص کی عقل معیار ہے، تو گزارش ہے کہ جب ہر شخص اپنی عقل کے لحاظ سے مکلّف ہے، تو آپ حضرات نے یہ حماقت کیوں کی کہ اپنے خیالات و عقائد کا دوسروں کو پابند کرنے کے لیے رسالے نکالے، مضامین چھپوائے اور کتابیں شائع کیں۔ اگر کوئی شخص حدیثوں کو واجب التسلیم کہتا ہے، اور ان کے مضامین کو خلاف عقل نہیں سمجھتا، تو آپ کیوں حدیثوں کو خلافِ عقل باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، منکرینِ حدیث نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر حدیثوں کے انکار کے لیے ان کا یہی حیلہ کافی ہے، تو حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا عذر خدا نے کیوں نہ مان لیا؟ آخر انھوں نے بھی تو تعلیمات شعیبؑ کو قبول کرنے سے اسی لیے انکار کیا تھا کہ یہ تعلیمات ہماری عقل میں نہیں آتیں:

قالوا یا شعیبُ ما نفقهُ کثیراً مما تقولُ — اے شعیب تمھاری بہت سی باتیں ہم نہیں سمجھتے (ہماری عقل میں نہیں آتیں)

اسی طرح یہودیوں نے بھی رسولِ خدا ﷺ سے کہا تھا:

قلوبنا غلف ہمارے دل بند ہیں، اس میں آپ کی باتیں نہیں سماتیں۔ یعنی آپ کی باتیں خلافِ عقل و فہم ہیں۔

منکرینِ حدیث کے اصول پر ان کا عذر نہایت معقول تھا، مگر خدا نے اس عذر کی مطلق سماعت نہیں فرمائی، بلکہ ان کا یوں رد کیا: ﴿بل لعنهم الله بكفرهم فقليلا ما يومنون﴾ یعنی رسول خدا ﷺ کی باتیں خلاف عقل نہیں ہیں، بلکہ منکرین پر خدا نے ان کے انکار کی وجہ سے لعنت کر دی ہے، اب ان سے ایمان کی توقع بہت کم ہے۔

اسی طرح مشرکین نے بھی بہانہ نکالا تھا کہ ﴿قلوبنا في اكنة مما تدعونا اليه﴾ (یعنی جس بات کی طرف ہم کو آپ دعوت دیتے ہیں، اس کی نسبت سے ہمارے دل پردے میں ہیں)

منکرینِ حدیث کے خیال سے تو یہ بڑی اٹل دلیل انکارِ رسول کی ہے، مگر در حقیقت وہ ایسا لغو اعتراض کر کے مکذبینِ انبیاء علیہم السلام کے پیرو بن رہے ہیں: ﴿لبئس ما كانو يعلمون﴾۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج تک منکرینِ حدیث نے کوئی خلافِ عقل حدیث پیش نہیں کی، اور جن حدیثوں کو وہ خلافِ عقل سمجھ کر پیش کرتے ہیں، در حقیقت وہ خلافِ عقل نہیں ہیں، بلکہ خود ان کی عقل نارسا کا قصور ہے، اس کے علاوہ ان احادیث کے مضامین اکثر و بیشتر قرآن کریم سے ثابت ہیں، مثلاً بہت سے عقل پرست حشر و نشرِ اجساد، قیامت، ملائکہ، معراج جسمانی، عذاب و ثواب، برزخ اور جنت و دوزخ وغیرہ کو خلافِ عقل کہتے ہیں، لیکن ان میں کوئی چیز خلافِ عقل نہیں ہے، اور یہ ساری چیزیں صرف احادیث سے نہیں، بلکہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہیں، پس اگر انکارِ حدیث کی یہی بنیاد ہے، تو منکرینِ حدیث کو سب سے پہلے قرآن کریم سے

ہاتھ اٹھانا پڑے گا، أعاذنا اللہ و ایاھم من ذلک.

پھر یہ حیلہ اصولی طور پر انکارِ حدیث کی علت کسی طرح نہیں بن سکتا، بلکہ اگر یہ علت ہر طرح صحیح بھی تسلیم کر لی جائے، تو اس کی بنا پر صرف ان احادیث کا انکار صحیح ہو سکتا ہے، جن میں خلافِ عقل امور مذکور ہوں، پس یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ معدودے چند احادیث کی وجہ سے سارا ذخیرۂ حدیث بے اعتبار و بے کار قرار دے دیا جائے، کیا اس کی بعینہٖ وہی مثال نہ ہوگی کہ ایک شخص کے پاؤں میں ناسور ہو جائے، اور ڈاکٹر صرف پاؤں کاٹنے کے بجائے اس مریض کا ہی خاتمہ کر دے۔

جی چاہتا تھا کہ اس مسئلہ کو ذرا تفصیل سے لکھوں، لیکن افسوس کہ یہ اس تفصیل کا موقع نہیں ہے، آگے ابھی بہت ساری باتیں لکھنی ہیں، اس لیے میں اپنے ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے معاف فرمائیں، اور مزید تفصیل مطلوب ہو، تو علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندیؒ کا رسالہ ''العقل والنقل'' ملاحظہ فرمائیں۔

منکرینِ حدیث کو جو وسوسے پیش آئے ہیں، میں نے ان کو مع جواب کے ذکر کر دیا، ممکن ہے کچھ اور وسوسے بھی ان کے دل میں آتے ہوں، لیکن مذکورہ بالا وسوسوں سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ منکرینِ حدیث کے وسوسے کہاں تک قابلِ توجہ و التفات ہو سکتے ہیں، اور سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کسی عاقل کو ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نامعقولیت، بوداپن اور کمزوری میں شک ہو سکتا ہے؟ اس لیے مزید تطویل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یہاں تک جو کچھ مذکور ہوا، یہ درحقیقت رسالہ مذکور کا اصولی رد یا اس پر اجمالی تبصرہ تھا، اب میں چاہتا ہوں کہ رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ کر کے اس کے تار تار الگ کر دوں، واللہ الموفق۔

منکرین حدیث کے رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ

رسالہ زیرِ نظر کی ابتدائی سطروں میں ’’حق گو‘‘ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ:

’’مخالفینِ اسلام نے قرآن و اسلام پر جو حملے کیے ہیں، ان کی لفظ بہ لفظ تائید کتبِ حدیث سے ہوتی ہے‘‘

پھر انھوں نے مختلف عنوان قائم کر کے گیارہ صفحات میں اس دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ تو ’’حق گو‘‘ صاحب کو آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ ان کا دعویٰ کہاں تک درست ہے، اور وہ اس کو ثابت کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں، سرِ دست میں ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں، اگر بفرضِ محال ان کا دعویٰ صحیح بھی ہو، اور ان کے دلائل بھی سب درست ہوں، تو اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ لازم آتا ہے کہ جن حدیثوں سے مخالفین کے حملوں کی تائید ہوتی ہے، وہ قابلِ تسلیم نہیں ہیں، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا، کہ بقیہ حدیثیں بھی لائقِ اعتبار نہیں ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ بجائے مخصوص احادیث کے منکرین حدیث ساری حدیثوں کا انکار کرتے ہیں؟ آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ پاؤں کے ناسور کی وجہ سے بجائے پاؤں کاٹنے کے خود مریض ہی کو قتل کر دیا جائے۔

پھر یہ بھی عجیب ذہنیت ہے، کہ مخالفین کے لغو اور بیہودہ اعتراضات کی وجہ سے اپنے مسلّمات کو خیر باد کہہ دیا جائے، اگر منکرین حدیث کا یہی اصول ہے، تو حدیث سے پہلے ان کو قرآن کریم سے انکار کرنا پڑے گا، کیا ان کو معلوم نہیں ہے، کہ

مخالفینِ اسلام نے براہِ راست قرآن کریم پر بھی حملے کیے ہیں؟ کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ دشمنانِ اسلام نے قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور قرآنی احکام کے منزل من اللہ ہونے پر بھی نکتہ چینیاں کی ہیں؟ تو کیا وہ ان نکتہ چینیوں کی وجہ سے قرآن سے روٹھ جائیں گے؟

''حق گو'' صاحب نے گویا اپنے دعویٰ کے ثبوت میں سب سے پہلی بات تو یہ لکھی ہے کہ حدیثوں سے قرآن کا محرّف اور ناقص ہونا ثابت ہوتی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ہم روافض کو مطعون کیا کرتے ہیں کہ وہ قرآن کو محرف و ناقص بتاتے ہیں، لہٰذا وہ قطعی کافر ہیں، مگر کیا یہ حدیثیں صحاح ستہ کی نہیں ہیں''۔

اس کے بعد چند حدیثوں کے ترجمے اس غرض کے لیے نقل کیے ہیں کہ ان سے قرآن کا محرف و ناقص ہونا ثابت ہے۔

لیکن مجھ کو بے حد افسوس ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے یہاں پر انتہائی خیانت اور حد درجہ سفاہت اور بے عقلی کا ثبوت دیا ہے، کسی بات کے سمجھنے سے پہلے بول دینے کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہوتا ہے، کہ بولنے والے کی حماقت ظاہر ہو جاتی ہے، ''حق گو'' صاحب کو خبر تو ہے نہیں کہ شیعوں کا عقیدہ قرآن کی نسبت کیا ہے؟ اور جو حدیثیں انھوں نے نقل کی ہیں ان میں کیا بیان ہے؟ مگر خواہ مخواہ اس لیے کہ ''ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں'' لگے ان عملی مسائل کی ٹانگ توڑنے، اس لیے میں پہلے شیعوں کا عقیدہ ''حق گو'' صاحب کو بتاتا ہوں، اس کے بعد ان کی ذکر کی ہوئی حدیثوں کا مفہوم ان کو ذہن نشین کراؤں گا۔

روافض کا عقیدۂ تحریف قرآن

''حق گو'' صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ روافض قرآن کریم کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ:

آنحضرت ﷺ پر جو قرآن نازل ہوا تھا، اس کا پورا حافظ بجز حضرت علیؓ کے کوئی نہ تھا، اور اس قرآن میں حضرت علیؓ اور بقیہ گیارہ ''ائمہ معصومین'' کی ولایت و امامت کی نام بنام تصریح و تنصیص تھی، اور وہ موجودہ قرآن سے بہت بڑا تھا، اس قرآن میں ستر ہزار آیتیں تھیں، مگر جب عہد صدیقی میں قرآن جمع کیا گیا، تو صحابہ نے قرآن کے بہت سے الفاظ بدل دیئے اور بہت سے کلمات نکال ڈالے، امامتِ ائمہ والی آیتیں بالکل حذف کر ڈالیں، کچھ آیتیں صحابہ نے خود بنا کر داخل کر دیں اور اس کی ترتیب بھی گڑبڑ کر دی (ثبوت کے لیے دیکھو اصول کافی طبع لکھنؤ ص ۲۶۲، ص ۶۷۱ و ص ۲۶۸، احتجاج طبرسی مطبوعہ ایران ص ۱۱۹ تا ۱۳۲، دیباچہ تفسیر صافی طبع ایران، تفسیر قمی طبع ایران، فصل الخطاب ص ۹۷)۔

اور رافضی مصنفین اقرار کرتے ہیں کہ اس مضمون کی متواتر روایتیں ائمہ معصومین رضی اللہ عنھم سے منقول ہیں، اور اقرار کرتے ہیں کہ ان روایتوں سے قرآن کا محرف ہونا صراحۃً ثابت ہے، اور اقرار کرتے ہیں کہ اسی بنا پر علماء مذہب شیعہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن محرف ہے (دیکھو فصل الخطاب طبع ایران)

اتنا معلوم کرنے کے بعد ''حق گو'' صاحب اپنی پیش کردہ روایات پر ایک بار پھر نظر ڈال کر بتائیں کہ ان روایات سے عقیدہ مذکورہ روافض کا کون سا جزء ثابت

ہوتا ہے؟

"حق گو کی پیش کردہ روایات کا مفہوم" "حق گو" صاحب کو اگر عقل سے دور کا علاقہ بھی ہوتا، تو وہ سمجھ سکتے کہ ان کی پیش کردہ روایتوں میں سوائے اس کے اور کچھ مذکور نہیں ہے کہ ایک آیت اتری، پھر اس کی تلاوت ہوگئی، یا یہ کہ فلاں سورہ میں فلاں آیت بھی عہدِ نبوی میں پڑھی جاتی تھی، یا یہ کہ فلاں آیت کو ایک صحابی یوں پڑھتے تھے، اور دوسرے صحابی دوسری طرح پڑھتے تھے، لیکن ان تینوں باتوں میں سے کسی سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن میں جامعین قرآن رضی اللہ عنھم نے تحریف کر دی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس روایت میں کسی آیت کی تلاوت کا موقوف ہو جانا مذکور ہے، اس کا صاف و صریح مفہوم یہ ہے کہ ....

....

اس آیت کی تلاوت کو خود خدا نے موقوف فرما دیا اور ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ صاحبِ کتاب کا اپنی کتاب کے کسی حصے کو اپنی کتاب سے نکال دینا تحریف نہیں ہے، تحریف تو اس کو کہتے ہیں کہ صاحبِ کتاب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس کی کتاب میں اس قسم کا تصرف کرے۔

اسی طرح جن روایات میں یہ مذکور ہے کہ فلاں سورہ میں فلاں آیت بھی عہدِ نبوی میں پڑھی جاتی تھی، ان میں بھی تحریفِ قرآن کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔

ایک اعتراض کا جواب اگر آپ کہیں کہ ہاں روایات میں یہ تو نہیں ہے، لیکن جس آیت کا ذکر ان روایات میں ہے، وہ قرآن میں نہیں ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن محرف ہے؛ تو میں کہوں گا کہ یہ آپ کی غلط فہمی ہے، قرآن میں اس آیت کے نہ ملنے پر بھی قرآن کا محرف ہونا ثابت نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ یہ نہ ثابت کیجئے کہ صحابہ رضی اللہ عنھم

نے اس آیت کو قرآن سے نکالا، اور اس کو آپ ہماری کسی روایت سے ثابت نہیں کر سکتے، اصلیت یہ ہے اور ان روایات کا مفہوم بھی یہی ہے، کہ وہ آیت پڑھی جاتی تھی، لیکن پھر خدا نے اس کی تلاوت موقوف کر دی، کسی آیت کی تلاوت کا منسوخ کر دینا ایک قسم کا نسخ ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن کریم میں ہے، جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

اختلاف قرأت کی حیثیت اور تیسری قسم کی روایات جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اختلاف قرأت کا ذکر ہے، ان کو بھی تحریف کے مسئلہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، اختلافِ قرأت کی قریب قریب وہی حیثیت ہے، جو کتابوں میں نسخوں کے اختلاف کی حیثیت ہوتی ہے، تو جس طرح کہ ان مختلف نسخوں میں سے جس نسخے کو پڑھنے والا چاہے اختیار کر سکتا ہے، اور اس پر الزام تحریف عائد نہیں ہو سکتا؛ اسی طرح قرآن کریم کے بعض الفاظ و کلمات میں مختلف قرأتیں ہیں، اور وہ سب آنحضرت ﷺ کی تعلیم سے ثابت ہیں، پس جس صحابی نے جو لفظ جس طرح آنحضرت ﷺ سے سنا تھا، اگر اس کو اسی طرح پڑھا تو اس کو تحریف کہنا سراسر جہالت ہے۔

تمثیل کے طور پر سنئے کہ سعدی علیہ الرحمۃ کے اس شعر کے پہلے مصرع میں دو نسخے ہیں:

۱- عزیزے کہ ہر کز درش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نہ یافت

۲- عزیزے کہ از درگہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

جس کا مطلب یہ ہے کہ مصنفؒ کی طرف سے دونوں طرح پڑھنے کی اجازت ہے، لہذا ان میں سے جو نسخہ کسی نے پڑھا خطاوار نہ ہوگا، نہ اس پر تحریف کا الزام عائد ہوگا، پس اسی پر اختلافِ قرأت کے مسئلہ کو قیاس کر لیجیے۔

نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ''حق گو'' صاحب نسخ کے منکر ہیں اور ان کو نسخ و تحریف کا فرق بھی معلوم نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کو اپنی پیش

کردہ روایات کے صحیح مفہوم تک رسائی نہ ہوسکی، اور اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے، کہ یہ روایات تحریف قرآن پر دلالت کرتی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ان کے سامنے نسخ کی تعریف اور اس کا ثبوت پیش کیا جائے۔

نسخ کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی آیت کی صرف تلاوت یا اس کے حکم یا دونوں کو اس لیے موقوف کردے، کہ اس کی مدت ختم ہوگئی، اور چونکہ اس کا نفاذ اتنے ہی زمانہ کے لیے ہوا تھا، اور جو غرض اس کے نفاذ سے وابستہ تھی، وہ حاصل ہوگئی، لہذا اب آئندہ اس کو موقوف کیا جاتا ہے۔

ہر ملت و مذہب میں ناسخ و منسوخ کی مثالیں موجود ہیں، اور اس کا راز یہ ہے کہ اصلاح چاہے جسمانی ہو یا روحانی، اصول کے ساتھ اور بتدریج ہو، تو بہت مفید و نافع ہوتی ہے، اور اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے، اور اس طرح مرض کا دفعیہ بھی بالکلیہ ہوتا ہے، اور مریض کو زیادہ مشقت و دشواری بھی پیش نہیں آتی، اور اس اصولی و تدریجی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ پہلے مریض کو کوئی آسان طریقِ اصلاح بتا کر اس کا پابند بنایا جائے، جب کچھ دن گزر جائیں اور طبیعت میں دوسرے علاج کے لیے مناسب استعداد پیدا ہو جائے، تو پہلے علاج کو موقوف کر کے دوسرے کی ہدایت کی جائے، اور یونہی رفتہ رفتہ مرض کے جملہ اسباب کو فنا کرنے اور طبیعت کو اس کے اصلی اعتدال پر لانے کی تدبیر کی جائے۔

فرض کیجئے ایک شخص کا خون فاسد ہوگیا ہے، اور وہ اس کی وجہ سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے، جب یہ آدمی طبیب کے پاس جائے گا، تو طبیب پہلے منضج کا نسخہ لکھے گا، اور ایسی دوائیں دے گا کہ مادہ میں پختگی آجائے، کچھ دنوں کے استعمال سے جب یہ غرض حاصل ہو جائے گی، تو طبیب نسخہ بدل دے گا، اور بجائے اس کے مسہل آور دوائیں دے کر مواد فاسد کا اخراج کرے گا، لیکن چونکہ مواد فاسد

کے ساتھ ساتھ کچھ صالح اجزاء بھی خارج ہو جاتے ہیں، اور مریض کو نقاہت ہو جاتی ہے، اس لیے پھر تیسرا نسخہ لکھے گا، تاکہ اس نقصان کی تلافی ہو، اور نقاہت رفع ہو جائے۔

اسی مثال پر روحانی اصلاح کو بھی قیاس فرمایئے، کہ جب کسی قوم میں اخلاقی امراض پیدا ہو جاتے ہیں، اور ان کی روحانی حالت بہت بدتر ہو جاتی ہے، تو اللہ رب العزت اپنی غایتِ رافت و وفورِ رحمت سے اس کی اصلاح کے لیے کسی طبیب روحانی (رسول) کو مبعوث فرماتا ہے، اور چونکہ خدا اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، اس لیے یک بارگی ان پر سخت سخت پابندیاں عائد نہیں کرتا، بلکہ بتدریج ان کی اصلاح کی تدبیر کرتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ پہلے ایک حکم دے کر اس کی پابندی کراتا ہے، پھر جب دوسرے حکم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، تو پہلا حکم اٹھا کر دوسرے کی پابندی لازم کرتا ہے، اسی کو اصطلاح شریعت میں ''نسخ'' کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک صورت اور بھی ہوتی ہے، آپ نے جسمانی اصلاح کے سلسلہ میں بار بار مشاہدہ کیا ہوگا کہ اطباء جسمانی ایک ہی مرض کا مختلف علاج کرتے ہیں، جس کی وجہ بعض دفعہ یہ ہوتی کہ اس مرض کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، لہذا پہلے طبیب یہ دیکھتا ہے کہ یہ مرض کیوں پیدا ہوا، پس جو سبب اس کو معلوم ہوتا ہے، اسی کے دفعیہ کی کوشش کرتا ہے، مثلاً بخار ایک مرض ہے، لیکن اس کے اسباب مختلف ہیں، کسی کو بخار آتا ہے، اور اس کا سبب فسادِ بلغم ہوتا ہے، اور کسی کو فساد صفراء کی وجہ سے آتا ہے؛ پس باوجودیکہ مرض ایک ہی ہے، لیکن علاج مختلف ہوگا، طبیب ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ تدابیر اختیار کرے گا۔

اور بعض دفعہ اختلافِ علاج کی وجہ زمانہ یا مقام یا مزاج کا اختلاف ہوتا ہے، ایسا بہت ہوتا ہے کہ ایک خاص طریقِ علاج ایک خاص مرض کے لیے موسم گرما

میں مفید واقع ہوتا ہے، لیکن وہی علاج اسی مرض کے لیے سردیوں میں مفید نہیں ہوتا، ایک علاج گرم ممالک میں کسی خاص مرض کے لیے تیر بہدف ثابت ہوتا ہے، لیکن سرد ملکوں میں اس سے کوئی نفع نہیں ہوتا، یا گرم مزاج والے کے لیے نافع ہوتا ہے اور سرد مزاج والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

بالکل یہی حال روحانی علاج کا بھی ہے، کہ ایک قوم کے لیے جو اصلاحی تدبیر اختیار کی جاتی ہے، وہ تدبیر بعض اوقات میں دوسری قوم کے لیے زمانہ کے بدل جانے سے یا اختلافِ مزاج یا تفاوتِ اسباب کی وجہ سے مفید نہیں ہوتی، اس لیے اللہ رب العزت قوموں کی اصلاح کے لیے جو شریعتیں نازل کرتے ہیں، بسا اوقات ان کے احکام میں ترمیم و تنسیخ بھی فرماتے ہیں، نسخ کی ایک صورت یہ بھی ہے۔ میرے اس بیان سے ''نسخ'' کی حقیقت آپ نے سمجھ لی ہوگی، اور آپ کو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہر اصلاحی تحریک اور ہر حکیمانہ طریقِ علاج کے لیے نسخ ضروری چیز ہے، اور شرائع الٰہیہ میں ناسخ و منسوخ کا وجود عیب و نقص نہیں، بلکہ ان کا حسن و کمال ہے، لیکن جن لوگوں نے ''نسخ'' کی حقیقت کما حقہٗ نہیں سمجھی ہے، ان کو مختلف قسم کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں، ایک جماعت نے یہ خیال کیا کہ ''نسخ'' سے باری تعالیٰ کا جہل لازم آتا ہے، اس جماعت کو نسخ پر ''بدا'' کا دھوکا ہو گیا، اور ان دونوں کو اس نے ایک سمجھ کر یہ خیال قائم کر لیا، حالانکہ دونوں میں بڑا عظیم الشان فرق ہے، ''بدا'' کی حقیقت یہ ہے کہ ایک حکم دینے کے بعد حکم دینے والے کا علم بدل جائے، اس کی رائے میں انقلاب پیدا ہو جائے، اور اس حکم کو واپس لے لے، اور اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرے: برخلاف ''نسخ'' کے کہ اس میں علم نہیں بدلتا، بلکہ اس میں پہلے ہی سے یہ علم رہتا ہے کہ حکم اول ایک خاص مدت تک کے لیے ہے، اس کے بعد دوسرا افلاں حکم نافذ کیا جائے گا، اور پہلے حکم کو موقوف کر دیا جائے گا۔ کیا طبیب کو تنسیخ کا نسخہ لکھنے کے وقت یہ علم نہیں ہوتا کہ

اس نسخہ پر پانچ سات دن سے زیادہ عمل نہ کرایا جائے گا؟ اور کیا جب مسہل تجویز کرتا ہے، تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں نے منضج دینے میں غلطی کی تھی، اور اب اس غلطی پر متنبہ ہو کر دوسری رائے قائم کرتا ہوں؟ ہرگز نہیں! اسی مثال پر ''نسخ'' کے احکام کو بھی قیاس کیجئے، تو آپ پر ظاہر ہو جائے گا، کہ نسخ دلیلِ جہل نہیں، بلکہ نہایت زبردست حکمت اور ایک عظیم الشان علم کی روشن دلیل ہے۔

بعض مشرکین اور یہود کو اسی قسم کے شبہات پیش آئے، اور اسی بنیاد پر انھوں نے قرآن و مبلغ قرآن کے حق میں زبانِ طعن دراز کی، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

و اِذا بَدَّلْنَا آیَۃً مَکَانَ آیۃٍ و اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوا اِنَّمَا اَنتَ مُفْتَرٍ بل اکثرھم لا یَعْلَمُونَ (سورۃ نحل پ ۱٤)	جب ہم کسی آیت کے عوض میں دوسری آیت نازل کرتے ہیں اور ہم جس چیز کو نازل کرتے ہیں، اس کی حکمت و مصلحت کو خوب جانتے ہیں، تو مخالفین کہتے ہیں کہ (اے رسول) تم تو بس افترا پرداز ہو (خدا کہتا ہے کہ ہمارا رسول افترا پرداز نہیں ہے) بلکہ مخالفین میں سے اکثر و بیشتر اشخاص جاہل اور مصلحتوں سے ناواقف ہمارے کاموں کی حکمتوں سے بے علم ہیں۔

اس آیت سے ''نسخ'' کی حکمت کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی نبی عربی روحی لہ الفداء پر نازل کی ہے، اس میں بھی بعض چیزوں کو ایک خاص وقت تک کے لیے نازل کیا، اور پھر اس کو منسوخ فرما دیا، جس پر مشرکین معترض ہوئے، اسی مضمون کو ایک دوسری آیت میں بھی بیان کیا ہے:

ما ننسخ من آیۃٍ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا الم تعلم انّ	یعنی جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں، یا اس کو (لوگوں کے دلوں سے) فراموش

اللہ علیٰ کُلِّ شیءٍ قدیرٌ (بقرہ) — اور محو کردیتے ہیں، تو اس سے بہتر یا اسی کے مثل (دوسری) لاتے ہیں، کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس آیت میں بھی وہی حکمت سمجھائی گئی ہے، کہ جب کوئی آیت منسوخ کی جاتی ہے، تو اس کے بدلے اس سے اچھی یا ویسی ہی دوسری چیز لائی جاتی ہے، مگر چونکہ پہلی چیز کا اب وقت نہیں رہا، اس لیے وہ منسوخ کردی جاتی ہے۔

یہ دونوں آیتیں ''نسخ'' کے اثبات میں ایسی صریح ہیں کہ ان کے بعد کوئی ادنیٰ درجہ کا مؤمن بھی نسخ کا انکار نہیں کرسکتا، جب یہ ثابت ہو چکا، تو اب سنئے کہ ''نسخ'' کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آیت قرآن میں نازل کی گئی، اور کچھ دنوں تک اس کی تلاوت جاری رکھی، پھر کسی خاص مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے اس کی تلاوت موقوف کردی، مثلاً جب اصحابِ بیر معونہ نہایت بے دردی سے شہید کیے گئے، اور تمام مسلمانوں کو عموماً اور ان کے اعزہ کو خصوصاً نہایت صدمہ پہنچا، تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دل دہی وتسلی اور شہداء کی مقبولیت اور ان کی عزت وحرمت کے اظہار کے لیے ایک آیت نازل فرمائی، جب کچھ دنوں تک اس کی تلاوت ہو چکی اور مسلمانوں کے زخم مندمل ہو چکے اور شہداء کی عزت وحرمت دلوں میں راسخ ہو چکی، تو اس آیت کی تلاوت موقوف کردی گئی، اسی کا نام اصطلاح میں ''نسخِ تلاوت'' ہے۔

تحریف ونسخ کا فرق بہت سے کم علم یا ابلہ فریب لوگ تحریف ونسخ میں فرق نہیں کرسکے، اور نسخ تلاوت کی روایات کو تحریف کے ثبوت میں حماقت یا بے حیائی سے پیش کردیتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے، اوپر کے بیان سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا، کہ نسخ اس تصرف وتبدل کا نام ہے، جو کتاب کے نازل کرنے والے خود اللہ جل مجدہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے، اور تحریف کا یہ مطلب

ہوتا ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا خدا کے حکم و مرضی کے خلاف اس کی کتاب میں کوئی تصرف بے جا کرے، دیکھئے مصنفین اپنی تصنیفات میں رات دن محو و اثبات، ترمیم، تنسیخ اور اصلاح و اضافہ کرتے رہتے ہیں، اور دنیا میں کوئی دشمنِ خرد ایسا نہیں ہوا، جو اس کو تحریف کہتا ہو، لیکن ایک دوسرا شخص اس کتاب کا ایک لفظ بھی بدل دے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے کتاب میں تحریف کر دی، جب یہ فرق ذہن نشین ہو گیا، تو اب سنئے کہ روافض کا عقیدہ یہ ہے کہ کتاب اللہ میں کچھ انسانوں نے بہت سے بیجا تصرفات کیے ہیں، لہذا روافض تحریفِ قرآن کے قائل ہوئے، اور آپ نے ہماری جو روایتیں پیش کی ہیں، ان میں انسانوں کے تصرف کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ خدا کے تصرف کا ذکر ہے، لہذا ہم اہلِ سنت کو قائلِ تحریف کہنا جہالت اور افترا ہے۔

انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا

''حق گو'' صاحب نے دوسری بات یہ لکھی ہے:

''ہم روافض کو طعنہ دیا کرتے ہیں کہ انھوں نے نبوت اور خلافتِ راشدہ کو ذاتیات ونفسیات سے ملوّث کیا، مگر کس منہ سے؟ کیا یہ حدیث حضرت عائشہ کی مسلم میں موجود نہیں ہے''

اس کے بعد اس حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے، جس میں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیج کر ترکہ رسول اللہ ﷺ سے اپنا حصہ مانگنا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب دینا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے، اور یہ کہنا کہ حضور ﷺ اپنی زندگی میں اپنے صدقے کو جس طرح تقسیم کرتے تھے، میں اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں کرسکتا، اس پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا خفا ہو جانا اور ملاقات چھوڑ دینا، اور جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خبر نہ کرنا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تنہا ان کی نمازِ جنازہ پڑھ کر رات ہی کو دفن کر دینا مذکور ہے۔

میں حیران ہوں کہ ''حق گو'' صاحب کو عقل سے اتنی دشمنی کیوں ہے؟ ہم نے تو اس حدیث کے ایک ایک فقرہ کو بار بار پڑھا، لیکن ہم کو ''حق گو'' صاحب کے دعویٰ سے متعلق کوئی بات بھی نہیں ملی، صحیح مسلم کے علاوہ یہ حدیث صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں بھی ہے، اور ان کے اردو تراجم بکثرت دستیاب ہو سکتے ہیں، ہم اردو خواں طبقہ سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ لوگ پوری حدیث پڑھ کر انصاف سے کہیں کہ ''حق گو'' صاحب کے دعویٰ کو اس حدیث سے کیا تعلق ہے؟ کوئی انصاف سے کہے کہ

جب شیعوں اور سنیوں کی متفق علیہ حدیث (۱) میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، رسولوں کا متروکہ صدقہ ہوتا ہے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا متروکہ رسول علیہ ﷺ کو تقسیم نہ کرنا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حصہ نہ دینا نفسانیت ہے، یا عین للّٰہیت اور اتباع رسول؟

حضرت صدیق اکبرؓ سے سیدۃ النساءؓ کا ناراض ہونا اور اس پر اگر حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا خفا ہو گئیں، تو یہ ان کی لغزش تھی، یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی؟ اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی، تو اس میں حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ کا کون سا قصور ہے؟ ہاں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اطلاع کی ہوتی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بلا عذر شرعی شریک جنازہ نہ ہوتے، تو بیشک ان کا قصور تھا، مگر یہاں تو صاف تصریح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خبر نہیں بھیجی: بہر حال روایت سے خلیفہ راشد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نفسانیت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی، ہاں! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک طرح کی کمزوری ضرور ظاہر ہوتی ہے، لیکن یہ حضرات انسان تھے، اور انسانی کمزوریوں سے پاک نہ تھے، خطا ولغزش سے منزہ ومعصوم نہ تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جواب بالکل حق وصواب تھا، لیکن ان حضرات نے کامل مکرر غور نہ فرمایا، اس لیے رنجیدہ خاطر ہو گئے، لیکن بعد میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حق بجانب ہونا ظاہر ہو گیا، تو یہ رنجش جاتی رہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق بجانب ہونے کی سب سے بڑی زبردست دلیل یہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مسند

(۱) شیعوں کی سب سے مستند کتاب ''کافی'' کا مطالعہ کرو۔ ۱۲

آرائے خلافت ہوئے، تو انھوں نے بھی فدک وغیرہ کو یعنی ان جائدادوں کو۔جن میں اپنے حصہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا دعویدار تھیں۔تقسیم نہ کیا، اور ان میں ان ہی احکام کو جاری رکھا، جو عہدِ رسول اللہ ﷺ سے لے کر عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ تک جاری تھے، اور رنجش کے رفع ہونے کا ثبوت خود اسی حدیث میں موجود ہے اور بصراحت مذکور ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر میں بلایا، اور بڑی معذرت کی، فرمایا کہ ہم کو تو کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا تھا کہ خلافت کا حقدار آپ سے زیادہ کوئی ہوسکتا ہے، لیکن ہاں رنج صرف اتنی بات کا تھا، کہ جب آپ سے لوگوں نے بیعت کی تو اس وقت ہم لوگ موجود نہ تھے، کسی نے ہم کو بلا کر ہماری رائے بھی نہ پوچھی، خیر وہ بات تو گزر گئی، اب میں وعدہ کرتا ہوں کہ شام کو مسجد میں علی الاعلان آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں گا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وعدہ کا ایفا کیا، اس ملاقات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا خاندان مجھے اپنے خاندان سے زیادہ عزیز ہے، میں جو سلوک واحسان اپنے خاندان کے لیے ضروری سمجھتا ہوں، اس کو پہلے خاندان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کروں گا، اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جائدادِ رسول اللہ ﷺ کا قضیہ بالکل نہ چھیڑا۔

حضور ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے

''حق گو'' صاحب نے تیسری بات یہ کہی ہے:

''روافض کے اس وہم کی یقیناً ہم شدت سے تردید کریں گے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بجز معدودے چند صحابہ کے سب مرتد ہو گئے۔ سبحان اللہ ھذا بھتان عظیم، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود مسلم کی حدیث اس کی تائید میں یہ روایت پیش کر رہی ہے''

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے حدیث حوض پیش کی ہے، لیکن اس حدیث کو ان کے مدعا سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ حدیث حوض میں زیادہ سے زیادہ یہ مذکور ہے کہ ''کچھ لوگ میری امت کے لائے جائیں گے، اور ان کو بائیں طرف (یعنی دوزخ کی طرف) لے جایا جائے گا، آنحضرت ﷺ فرمائیں گے کہ یا رب یہ تو میرے لوگ ہیں، جواب میں کہا جائے گا: آپ نہیں جانتے، انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ آپ جب سے ان سے جدا ہوئے، یہ لوگ ہمیشہ پھرتے ہی رہے''

اس میں اولاً تو صحابہ رضی اللہ عنھم کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ عام امت کے کچھ لوگوں کا ذکر ہے۔ ثانیاً اگر بفرض محال صحابہ رضی اللہ عنھم ہی مراد ہوں، تو کچھ صحابہ مراد ہوں گے، اور رافضیوں کا دعویٰ ہے کہ بجز معدودے چند کے سب صحابہ رضی اللہ عنھم مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ)۔ پھر معلوم نہیں ''حق گو'' صاحب نے کس طرح یہ کہہ دیا کہ اس حدیث سے رافضیوں کے دعوے کی تائید ہوتی ہے، ''حق گو'' صاحب کو رافضیوں کی دوستی اور حدیث کی دشمنی میں یہ بھی نظر نہ آیا کہ حدیث میں تو خود یہ بیان موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کون لوگ مرتد ہوئے تھے، اور حدیث زیر بحث کے مصداق کون لوگ ہیں؟

صحیح مسلم (۱/۳۷) مطبوعہ مجتبائی دہلی میں مذکور ہے کہ:

''جب آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، تو عرب کے کچھ لوگ (جو عہد نبویؐ میں) مسلمان ہوئے تھے، مرتد ہو گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے قتال کیا''

اس کے علاوہ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جو لوگ مرتد ہوئے تھے، وہ بنو حنیفہ وغیرہ کے کچھ لوگ تھے، ان میں کوئی مشہور صحابی نہ تھا (۱)، ثبوت کے لیے دیکھو کامل ابن اثیر جلد۳ ص ۱۳۰، مسعودی جلد۵ ص ۱۰۳، تاریخ الخلفاء ص ۵۱۔

حدیث و تاریخ کی ان تصریحات سے آنکھیں بند کر کے یہ لکھ دینا کہ حدیث زیرِ بحث سے رافضیوں کی تائید ہوتی ہے، عقل کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں ہے، تو اور کیا ہے؟

اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے مختلف عنوانوں کے تحت وہ روایتیں پیش کی ہیں، جن کا تعلق ان کے زعم فاسد میں براہِ راست مطاعنِ رسول ﷺ سے ہے، پہلا عنوان یہ ہے:

---

(۱) اور بعض غیر مشہور اشخاص جو صرف ایک بار خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تھے، وہ چند دنوں کے بعد ارتداد سے تائب ہو کر مدۃ العمر اسلام کے حلقہ بگوش رہے ۱۲ منہ۔

''آنحضرت ﷺ یہودیوں کی خرافات کو سن کر وحی الٰہی کی طرح پیش کرتے تھے''

اس عنوان کے ماتحت ''حق گو'' نے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث کا مضمون یہ ہے کہ:

''ایک یہودی عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم قبر میں آزمائے جاؤ گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ یہود کے واسطے ہوگا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر چند ہی راتیں گزری تھیں کہ رسول اللہ ﷺ عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے''

''حق گو'' صاحب اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

''۱- مشرکین و نصاریٰ کا یہ اعتراض ہے کہ نبی عربی لوگوں کی باتیں سن سن کر وحی الٰہی بنا کر پیش کرتے تھے، حدیث سے اس اعتراض کی تائید ہوتی ہے۔

۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے، وہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔

۳- قرآن میں عذاب قبر کے خلاف متعدد آیتیں موجود ہیں۔

۴- خود یہود کا عقیدہ بھی نہیں ہے''

جواب ''حق گو'' صاحب کی پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے اعتراض مذکور کی تائید تو کسی طرح نہیں ہوتی، اس اعتراض کی تردید ضرور ہوتی ہے، اور وہ اس طرح پر کہ اگر مشرکین و نصاریٰ کا یہ اعتراض صحیح ہوتا، تو رسول اللہ ﷺ یہودی عورت کا

مقولہ سن کر گھبراتے نہیں، اور نہ چند راتوں کے گزرنے کا انتظار کرتے، بلکہ سنتے ہی فوراً فرماتے کہ یہ عورت ٹھیک کہتی ہے، یہودیہ کی یہ بات سن کر گھبرا جانا اور چند راتیں گزرنے پر اس کی تصدیق کرنا ہی تو اس بات کی دلیل ہے، کہ جب تک براہ راست آپ پر من جانب اللہ وحی نہیں آتی تھی، اس وقت تک آپ کسی کی موافقت نہیں فرماتے تھے اور نہ کوئی بات کہتے تھے۔

عیسائی اور یہودی مذہب کی بکثرت تردید قرآن وحدیث میں اس کے علاوہ مشرکین ونصاریٰ کے الزام کی لغویت یوں بھی ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ دوسروں کی سنی سنائی باتوں ہی کو وحی بنا کر پیش کرتے، تو قرآن اور احادیث میں یہود و نصاریٰ یا مشرکین کے مسلک کے خلاف کوئی بات نہ ہوتی، لیکن قرآن وحدیث پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان فرقوں کے مسلک کے خلاف بے شمار باتیں شریعت محمدیہ علی صاحبھا التحیۃ میں موجود ہیں، کیا خود قرآن میں بتصریح مذکور نہیں ہے کہ اونٹ کا گوشت بنی اسرائیل کے لیے حرام تھا، مگر شریعت محمدیہ علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام میں حلال ہے؟ کیا قرآن میں مصرح نہیں ہے کہ مشرکین عرب بحیرہ و سائبہ وغیرہ کو حرام سمجھتے تھے، مگر شریعتِ محمدیہ (صلی اللہ علی صاحبھا) نے اس کی مخالفت کی؟ کیا قرآن میں مصرح نہیں ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور بعضوں نے الٰہ قرار دیا، لیکن نبی آخر الزماں ﷺ نے اس عقیدہ کی مخالفت اور سخت تردید کی، اور جس طرح یہ باتیں قرآن کریم سے ظاہر ہوتی ہیں اس سے بہت صاف حدیثوں میں مذکور ہیں۔

ایک اعتراض کا جواب اگر "حق گو" صاحب کہیں کہ چونکہ حدیث زیر بحث میں رسول اللہ ﷺ کا یہودیہ کی تصدیق کرنا مذکور ہے، اور اسی تصدیق و موافقت سے مخالفین کے الزام کی تصدیق ہوتی ہے؛ تو میں عرض کروں گا، کہ اگر ایک یا چند باتوں

میں موافقت پائے جانے ہی پر اس الزام کی بنیاد ہے، تو دنیا میں کوئی مذہب بھی اس الزام سے بری نہیں ہوسکتا، دنیا میں کوئی داعیِ مذہب ایسا نہیں گزرا ہے، جس کی کوئی نہ کوئی بات کسی سابق داعیِ مذہب کی بات کے موافق نہ ہو، بالخصوص حضرت مسیح علیہ السلام کی تو اکثر تعلیمات اگلے داعیِ مذہب کی تعلیمات سے حرف بحرف مطابق ہیں۔

قرآن پہلی آسمانی کتابوں کا مصدق ہے اس کو بھی جانے دیجئے اور مجھے یہ بتائیے کہ اگر آپ کے ترک وانکارِ حدیث کی یہی بنیاد ہے، تو آپ قرآن کریم پر کیسے ایمان لاسکتے ہیں؟ آخر قرآن بھی تو خود کو اگلی کتابوں کا مصدق بتاتا ہے، تو کیا قرآن کی تصدیق و موافقت سے مخالفین کا الزام قوی نہ ہوگا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اور اگر ہوگا تو آپ کا نزلہ حدیثوں ہی پر کیوں گرتا ہے؟

پھر اگر آپ کو مخالفین کے الزام ہی کا دفعیہ منظور تھا، تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ آپ مطلقاً ساری حدیثوں کا انکار کر کے بخیال خویش اس جوابدہی سے سبکدوش ہوجاتے، بلکہ صرف یہ فرمادیتے جب بھی سبکدوشی حاصل ہوجاتی، کہ حدیث زیر بحث میں یہ واقعہ جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، وہ صحت سے عاری ہے، کسی راوی سے بھول ہوگئی ہے، اس لیے اس نے اصل واقعہ کی صورت بدل دی، اصل واقعہ یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو عذاب قبر کا علم نہ تھا، جب یہودی عورت سے اس کا ذکر سنا، تو ان کو تعجب ہوا، لیکن آنحضرت ﷺ سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ عذاب قبر حق ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال سے آنحضرت ﷺ نے محسوس کیا کہ اس مسئلہ سے ابھی لوگ واقف نہیں ہوئے ہیں، اس لیے آپ نے نمازوں میں عذاب قبر سے پناہ مانگنا شروع کیا، تاکہ اس مسئلہ سے سب لوگ آگاہ ہوجائیں۔

معترض کی ناسمجھی دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حدیث مذکور میں کسی آیت کا حوالہ نہیں دیا ہے، شاید ''حق گو'' صاحب کو وحی کے انکار

سے دھوکا ہوا، اگر ایسا ہے تو یہ ان کی ناواقفیت ہے، بات یہ ہے کہ ''حق گو'' صاحب وحی کو قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

وحی غیر متلو کی حقیقت قرآن کے علاوہ بھی ایک وحی ہے، جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر جو وحی آتی تھی، اس کی دو قسمیں تھیں: ایک وہ جس کے معنی کے ساتھ الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہوتے تھے، اس کو حضور بعینہ ان ہی الفاظ میں لوگوں کو سناتے تھے، اسی کو قرآن اور کتاب اللہ کہتے ہیں؛ دوسری وہ جس کے صرف معنی نبی ﷺ کے قلب میں القا ہوتے تھے اور اس کو اپنے الفاظ میں حضورؐ بیان کرتے تھے، اسی کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔

اس کا ثبوت قرآن مجید سے اس کا ثبوت خود قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد ہے:

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ

(یعنی) ہم نے آپ پر کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ذریعہ فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سوجھائے اور سمجھائے۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر ہے: ایک کتاب، وہ تو وحی متلو ہے، دوسری وہ بات جو خدا تعالیٰ اپنے نبی کو سوجھائے اور سمجھائے، یعنی آپ کے قلب میں جو علوم و حکم و اسرار القا فرمائے، یہ وحی غیر متلو ہے۔

''حق گو'' کی عقلمندی کا نمونہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث زیر بحث میں جس وحی کا ذکر ہے، وہ یہی وحی غیر متلو ہے، لہذا اس کو قرآن میں تلاش کرنا ''حق گو'' صاحب کی عقلمندی ہے، ''حق گو'' صاحب کی اس ناواقفیت پر ہم کو بڑا افسوس ہے، اگر انھوں نے سرسری نظر سے بھی قرآن کو پڑھا ہوتا، تو ان کو معلوم ہوتا کہ دل میں کوئی بات ڈال دینے کے لیے لفظ ''وحی'' کا اطلاق بکثرت قرآن مجید میں ہوا ہے، مثلاً:

۱- وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ — یعنی ہم نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ

اتخذی من الجبال بیوتاً — بات ڈالی کہ بنا تو پہاڑوں میں گھر۔

۲ – و اوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیہ — یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں ڈالا کہ تو اس کو دودھ پلا۔

۳ – یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غروراً — یعنی ان کا بعض بعض کے دل میں ڈالتا ہے ملمع بات فریب کاری کی رو سے۔

کیا ''حق گو'' صاحب ان آیتوں میں وحی کا لفظ دیکھ کر اس جستجو میں مصروف ہو جائیں گے، کہ شہد کی مکھیوں پر کون سا قرآن نازل ہوا تھا، اور مادرِ موسیٰ علیہ السلام پر کون سی کتاب الٰہی نازل ہوئی تھی؟

عذاب قبر کا ثبوت قرآن مجید سے

تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ یہ آپ کی صریح غلط بیانی ہے، قرآن مجید میں عذاب قبر کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں نہیں، بلکہ اس کے برخلاف قرآن مجید کی متعدد آیات عذاب قبر کی مثبت ہیں، مثلاً:

و حاق بآل فرعونَ سوءُ العذابِ النَّار یُعرضون علیها غُدوّاً و عشیاً و یوم تقوم الساعة اَدْخِلوا آلَ فرعونَ اَشدَّ العذاب

یعنی آل فرعون پر بڑا عذاب نازل ہو گیا، وہ آگ جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں، اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو حکم ہوگا کہ آل فرعون کو سخت عذاب میں ڈالو۔

اس آیت میں آل فرعون کی ہلاکت کے بعد اور قیامت سے پہلے ان کے عذاب دیے جانے کا صراحۃً ذکر موجود ہے، اور عذاب قبر کا یہی مطلب ہے کہ موت کے بعد اور قیامت سے پہلے جس کو برزخ کہتے ہیں، مردوں پر عذاب ہوتا ہے۔

۲- و لو تری اذ یتوفی الذین کفروا الملئکة یضربون وجوههم و ادبارهم و ذوقوا عذاب الحریق

(یعنی) کاش تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی جان نکالتے ہیں درآنحالیکہ ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں چکھو جلنے کی سزا۔

اس آیت سے بلا کسی تاویل کے واضح ہے کہ موت ہی کے وقت سے کافروں کا عذاب شروع ہو جاتا ہے۔

۳- مِمَّا خطیٰئتهم اُغرِقوا فَاُدْخِلوا ناراً

یعنی قوم نوح اپنے گناہوں کے سبب ڈبو دی گئی پس آگ میں ڈالی گئی۔

یہ آیت بآواز بلند پکار رہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم غرقاب ہوتے ہی مبتلائے عذاب ہو گئی، حالانکہ قیامت ابھی تک نہیں آئی ہے، یہ عذاب قبر یعنی عذاب برزخ نہیں تو کیا ہے؟

عذاب قبر کے خلاف قرآن میں ایک لفظ بھی نہیں یہ تین آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی گئی ہیں، اس مضمون کی اور بہت سی آیتیں ہیں، اور ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن میں اس کے خلاف ایک حرف بھی نہیں ہے، ''حق گو'' صاحب یا ان کے اعوان والنصار میں جرأت ہو تو ایک ہی آیت پیش کر کے اپنی صداقت کا ثبوت دیں۔

''حق گو'' کا بے ثبوت دعویٰ چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ ''حق گو'' صاحب کا یہ دعویٰ کسی طرح قابلِ سماعت ولائق اعتبار نہیں ہے، جبکہ انھوں نے اپنے اس دعوے پر کہ ''یہودی منکرِ عذاب برزخ ہیں'' کوئی شہادت علماء یہود کی پیش نہیں کی، اگر ''حق گو'' صاحب میں کچھ بھی صداقت ہو، تو عہدِ نبوی کے علماء یہود یا توریت کی شہادت سے عذاب برزخ کی نفی ثابت کریں۔

''حق گو'' کی نقل کردہ دوسری حدیث ''حق گو'' صاحب نے عنوان بالا کے ثبوت میں دوسری حدیث یہ ذکر کی ہے:

''مروان نے اپنے دربان رافع سے کہا کہ ابن عباس کے پاس جا اور کہہ کہ اگر ہم میں سے ہر اس آدمی کو عذاب ہو، جو اپنے کیے پر خوش ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اس بات پر جو اس نے نہیں کی، تو ہم سب کو عذاب ہوگا، ابن عباس نے کہا: تم کو اس آیت سے کیا تعلق؟ پھر ابن عباس نے یہ آیت پڑھی ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ پھر اس آیت کو پڑھا: ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا﴾ ابن عباس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب سے کوئی بات پوچھی، انھوں نے اس کو چھپایا، اور اس

کے بدلے انھوں نے دوسری بات بتائی، اس حال میں کہ آپ کو یہ سمجھا دیا کہ ہم نے آپ کو وہ بات جو آپ نے پوچھی تھی بتادی، اور اپنی تعریف کے خواستگار ہوئے، اور اپنے کیے پر خوش ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان ہی کو فرمایا ہے کہ عذاب دے گا، اور (آیت میں وہی) اہل کتاب میں مراد ہیں''۔

''حق گو'' کے مدعائے باطل سے حدیث مذکور کی بے تعلقی یہ حدیث ''حق گو'' صاحب کے مدعا سے اور بھی زیادہ بے تعلق ہے، ہم کو تو سخت حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے عنوان مذکور کے ثبوت میں اس حدیث کو پیش کر کے عقلاء کی مجلس میں اپنا مضحکہ کیوں کرایا، کیا کسی غیر مذہب والے سے علمی مذاکرہ کرنا، کسی مسئلہ میں ان کا عقیدہ یا مسلک دریافت کرنا، صرف اس لیے ہوتا ہے کہ اس کو معلوم کر کے بطور سرقہ وانتحال کے اپنا مذہب وعقیدہ بنالیا جائے، یا معاذ اللہ اس کو وحی الٰہی بنا کر پیش کر دیا جائے، پھر حدیث میں تو یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ نے یہود سے کوئی مسئلہ پوچھا تھا، پھر آپ نے یہ کیسے خیال کر لیا کہ آپؐ نے ان سے کوئی مسئلہ ہی پوچھا ہوگا، یہ بھی تو ہوسکتا ہے، بلکہ اغلب یہی ہے کہ آپ نے ان سے یہ دریافت کیا ہوگا کہ میری پیشین گوئی تمھاری کتابوں میں ہے یا نہیں؟ اور اس سوال کا منشا صرف ان کی صداقت کا امتحان کرنا تھا۔

حدیث مذکور میں مشرکین اور نصاریٰ کا رد اور واقعہ تو یہ ہے کہ اس حدیث سے مشرکین ونصاریٰ کے اعتراض مذکور کا نہایت بلیغ رد ہوتا ہے، تقریر اس کی یہ ہے کہ یہود سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات پوچھی اور یہود نے صحیح جواب کے بجائے غلط جواب دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہود کے فعل کی مذمت فرمائی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ومرسل من اللہ نہ ہوتے، بلکہ یہود ونصاریٰ کی سنی ہوئی باتوں کو وحی بنا کر پیش کرتے ہوتے، تو یہود کے اس غلط جواب کو بھی وحی

کی صورت میں پیش کر دیتے، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ آپ نے اس کا غلط و خلاف واقع ہونا ظاہر فرمایا، لہذا معلوم ہوا کہ آپ کو یہود و نصاریٰ کی باتوں پر قطعاً اعتماد نہیں تھا، اور نہ ان کی باتوں کو وحی بنا کر پیش کرتے تھے، بلکہ آپ کا اعتماد صرف وحی الٰہی پر تھا، اور آپ کی تعلیمات کا مدار صرف وہ چیز تھی، جس کو خدا آپ پر القا کرتا تھا۔

"حق گو" اور اس کے ہم اعتقاد دوگونہ عذاب میں پھر "حق گو" صاحب سے ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال میں تو حدیث کی اشاعت عباسیوں کے زمانے میں ہوئی ہے (ص ۴)، لہذا مشرکینِ عہد نبوت کے الزام کی بنیاد حدیثوں پر تو ہو نہیں سکتی، کوئی اور چیز ہوگی، جس پر اس الزام کی بنیاد مشرکین نے قائم کی ہوگی، مجھے اس بنیاد کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ چاہے جو بنیاد بھی ہو، دو حال سے خالی نہیں ہے: ایک یہ کہ وہ بنیاد صحیح ہو (معاذ اللہ)، اس صورت میں حدیثوں کا انکار محض حماقت ہوگا، اس لیے کہ حدیثیں اصل بنیادِ الزام تو ہیں نہیں کہ ان کے انکار سے اصل بنیاد الزام بیخ و بُن سے اکھڑ جائے، پس کہاں کی عقلمندی ہے کہ حدیثوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور الزام بھی دفع نہ ہوا، اور اگر وہ بنیاد غلط ہو (اور واقعہ بھی یہی ہے بلکہ الزام کی در حقیقت کوئی بنیاد نہیں ہے) تو بھی انکارِ حدیث خالی از حماقت نہیں، اس لیے کہ اصل بنیاد کا قلع وقمع ہو جانے سے جب مشرکین کا دعویٰ ہباءً منثورا ہو چکا، تو اب تائید و شہادت کو معرضِ بحث قرار دینا اور اس کے رد و قبول کے درپے ہونا کھلی ہوئی بے عقلی ہے۔

مخالفین کے اعتراضات کی بنیاد صرف بغض و عناد پر ہے "حق گو" صاحب دراصل عقل سے ذرا کم کام لیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ مخالفینِ اسلام کے اعتراضات حدیثوں سے پیدا ہوتے ہیں، حالانکہ یہ محض فریبِ عقل ہے، مخالفینِ اسلام کے اعتراضات تو صرف عناد و بغض اور عداوت سے پیدا ہوتے ہیں، اگر

حدیثوں سے پیدا ہوتے، تو اس زمانے میں اعتراض کیوں پیدا ہوتا، کیا آپ کو قرآن مجید میں یہ آیات نہیں ملیں:

و قال الذین کفروا ان هذا الا افك افتراه و اعانه علیه قوم آخرون فقد جاء وا ظلما و زورا و قال اساطیر الاولین اکتتبها فهی تملیٰ علیه بکرۃً و اصیلا	یعنی کافروں نے کہا کہ یہ قرآن تو بس جھوٹ ہے جس کو نبی عربی نے بنا لیا ہے اور دوسروں نے اس افترا میں ان کی مدد کی ہے (خدا کہتا ہے کہ) کافروں کا یہ سراسر ظلم اور صریح جھوٹ ہے، کافروں نے یہ بھی کہا کہ یہ تو پہلوں کے افسانے ہیں، جن کو محمد (ﷺ) نے لکھ لیا، پس وہ افسانے صبح و شام ان پر املا کیے جاتے ہیں (اور وہ ان کو لکھتے رہتے ہیں)۔

دیکھئے ان آیات میں اس زمانے کا اعتراض مذکور ہے جب بہ خیال ''حق گو'' صاحب حدیثیں تھیں ہی نہیں۔

انکارِ حدیث کی بعد بھی معترضین کا منھ بند نہیں ہو سکتا اسی سے ''حق گو'' صاحب کی ایک اور غلط کاری ظاہر ہو گئی، وہ یہ کہ انھوں نے مخالفین کے الزامات کو رفع کرنے کے لیے انکارِ حدیث کی جو راہ نکالی ہے، وہ بالکل غلط اور بے نتیجہ ہے، اس لیے کہ حدیثوں کو بے اعتبار کرنے کے بعد بھی مخالفین کے اعتراضات بند نہیں ہو سکتے، آخر جب حدیثیں نہیں تھیں، تو مخالفین نے اعتراضات کس طرح کیے، اسی طرح حدیثوں کے انکار کے بعد کرتے رہیں گے۔

حدیث مذکور کو غلط کہنے کی دوسری وجہ
اور
اس کا جواب

''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ لکھی ہے کہ اس کے مخالف ایک دوسری روایت بھی آئی ہے، حالانکہ کوئی روایت مذکورۂ بالا حدیث کی مخالفت میں وارد نہیں ہوئی، حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے آیۃ ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ﴾ الآیۃ کا ایک دوسرا شانِ نزول جو مروی ہے، وہ مذکورہ بالا شانِ نزول کے مخالف نہیں ہے، بلکہ صورت یہ ہوئی ہے کہ دونوں واقعے یکے بعد دیگرے اتفاق سے پیش آئے، اور چونکہ دونوں واقعوں میں اپنی بیجا تعریف کی خواہش منافقین و یہود نے ظاہر کی تھی، اس لیے آیت دونوں پر برابر چسپاں تھی، پس جب آیت کا تعلق دونوں واقعوں سے تھا، تو اگر ایک صحابی نے یہود کے واقعہ کو اور دوسرے نے منافقین کے قصہ کو شانِ نزولِ آیت قرار دیا، تو اس میں کوئی تعارض وتصادم اور تخالف نہیں ہے۔

تیسری وجہ اور اس کی تغلیط ''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے غلط ہونے کی تیسری وجہ یہ بیان کی ہے کہ:

''ابن عباس آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بالکل کمسن بچے تھے، لہذا مروان ان سے یہ کیسے دریافت کرسکتا ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ سے اس آیت کے بارے میں کیا سنا ہے''

''حق گو'' صاحب کی یہ تیسری وجہ ان کے مبلغِ علم کی صاف پردہ دری کررہی ہے، اولاً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عہدِ نبوی میں بالکل کمسن بچے نہ تھے، بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا خود بیان ہے کہ وہ عہدِ نبوی ﷺ میں قریب بہ

بلوغ تھے (دیکھو بخاری ۱/۱۷) اور مورخین نے تصریح کی ہے کہ وہ وفات نبوی ﷺ کے وقت ۱۳/۱۴ سال کے تھے، نبی ﷺ کے ارشادات سننے اور سمجھنے کے لیے یہ بہت کافی سن ہے، بالخصوص شریف گھرانوں اور عمدہ تربیت کے لڑکے تو اس سن میں بہت ذہین و ہوشیار ہو جاتے ہیں، لہذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا آنحضرت ﷺ کی حدیثوں کو خود حضور علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے سننا نہ مستبعد ہے نہ محلِ تعجب۔

ثانیاً روایت میں یہ ذکر بھی نہیں ہے کہ "اے رافع! ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ پوچھنا کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے اس آیت کے بارے میں کیا سنا ہے"، روایت میں تو صرف اتنا ہے کہ اے رافع! ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس جا کر ہمارا یہ اشکال پیش کر دے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "حق گو" صاحب اپنا لکھا ہوا بھی نہیں سمجھتے۔

پھر "حق گو" صاحب نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بالکل کم سن ثابت کرنے کے لیے یہ لکھا ہے:

> "ان کو آنحضرت (صلعم) نے اس وقت جب کہ وہ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، معاویہ کے پاس بھیجا اور معاویہ فتح مکہ کے بعد مسلمانوں میں شامل ہوئے، لہذا معلوم ہوا کہ وہ فتح مکہ تک بالکل بچے تھے"

لیکن "حق گو" صاحب کی یہ ساری قیاس آرائیاں غلط ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فتح مکہ کے سال گیارہ برس کے تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بے شک فتح مکہ کے بعد مسلمانوں میں شامل ہوئے، لیکن جس روایت میں ان کے بلانے کا ذکر ہے، اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو مسلمان ہونے کے بعد بلایا، اور جب یہ تصریح نہیں ہے تو ہو سکتا ہے کہ قبل اسلام آنحضرت ﷺ نے ان کو بلایا ہو، اور اس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ایسے کمسن ہوں

کہ بچوں کے ساتھ ساتھ کھیلتے رہے ہوں، ''حق گو'' صاحب بتائیں کہ انھوں نے کس دلیل سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بلانے کے واقعہ کو فتح مکہ کے بعد مانا ہے۔

''حق گو'' کی تاریخ سے افسوسناک بے خبری ''حق گو'' صاحب نے اسی بحث میں اپنی بے نظیر ''تاریخ دانی'' کا ثبوت بھی دیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ نے حضرت میمونہ سے فتح مکہ کے بعد نکاح کیا ہے۔''

حالانکہ اب تک سارے مورخین و محدثین یہی جانتے تھے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ۷ھ میں عمرۃ القضا کے سفر میں نکاح ہوا ہے۔ (دیکھو بخاری ۲/۶۱۱ بروایت ابن اسحٰق، وزرقانی ۲/۲۶۲ و ۳/۲۵۰ وزاد المعاد ۴/۲۵۷)

''حق گو'' صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

''راوی نے ابنِ عباس کو جو بدنام کیا، اس کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ حدیث کی اشاعت عباسیوں کے عہد میں ہوئی اور ابن عباس کا نام اپنے ساتھ بہت سی دنیوی برکات اپنے ساتھ لیے ہوا تھا''

لیکن ''حق گو'' صاحب نے اس کی کوئی توجیہ نہ کی کہ راوی نے عباسیوں کے دشمن مروان اموی کا نام لیا، آخر مروان کے نام پر عباسیوں سے کس نفع کی توقع تھی؟ اور ''حق گو'' صاحب نے اس کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا کہ وہ خود صفحہ ۲۳ میں لکھتے ہیں کہ ابن شہاب زہری نے بھی حدیث کی ایک کتاب لکھی ہے اور ابن شہاب کا زمانہ عباسیوں سے پہلے ہے، پھر ان کا یہ فرمانا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ عباسیوں کے عہد میں حدیث کی اشاعت ہوئی۔

''حق گو صاحب نے دوسرا عنوان یوں قائم کیا ہے:

''آنحضرت ﷺ کی خواہشات نفسانی کے لیے خدا وحی اتارا کرتا ہے''۔

اور اس کے ثبوت میں یہ حدیث ذکر کی ہے:

"حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ یہ عورت شرم نہیں کرتی ہے جو اپنے تئیں بخش دیتی ہے، آنحضرت پر یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ﴿تُرْجِي مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ﴾ الخ تب میں نے کہا آپ کا رب آپ کی خواہشات نفسانی کے مطابق (وحی اتارنے میں) جلدی کرتا ہے"

اور اس کے بعد لکھا ہے کہ:

"یہ کسی زندیق کا قول ہے جو بیک وقت آنحضرت ہی پر نہیں بلکہ خدائے قدوس پر بھی حملے کر رہا ہے، قرآن میں یہ آیت آپ کی منکوحہ بیویوں کے بارے میں ہے، سیرۃ حلبی والے نے غالباً اسی روایت سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ آپ پر بلا شرط نکاح عورتیں حلال کی گئی تھیں"

ہویٰ کے معنی "حق گو" صاحب میں بڑا عیب یہ ہے کہ احادیث کی خود اپنے جی سے ایک غلط تشریح کرتے ہیں، پھر اسی تشریح کی بنیاد پر حدیثوں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حدیث مذکورہ بالا میں ایک لفظ ہویٰ کا واقع ہے، اس کا ترجمہ "حق گو" صاحب نے خواہشات نفسانی کر کے ایک بیہودہ الزام قائم کر دیا، حالانکہ صحیح ترجمہ (۱) ہویٰ کا رضا اور پسند ہے، اور اس فقرہ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مرغوب و پسندیدہ چیز کی اجازت دینے میں اللہ تعالیٰ دیر نہیں کرتا، اور یہ مفہوم خود قرآن کریم سے ثابت ہے ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ یعنی البتہ بہت جلد اللہ تعالیٰ آپ کو دے گا (جو آپ چاہیں گے) پس آپ خوش اور راضی ہو جائیں گے۔ دیکھئے یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ خدا آپ کے مرغوبات آپ کو ضرور عطا کرے گا اور آپ کی خوشی ضرور پوری کرے گا، اور اسی مضمون کو حدیث میں بھی بیان کیا گیا ہے، اب اگر "حق گو" صاحب یہی کہیں کہ "ہویٰ" کی صحیح ترجمہ خواہشات

---

(۱) جیسا کہ خود راوی حدیث نے ہویٰ کی تفسیر رضا سے کر دی ہے دیکھو مسند احمد ۱۲ منہ۔

نفسانی ہی ہے،؛ تو میں کہوں گا کہ اس مقام پر ''ہویٰ'' کا یہ ترجمہ کرنا انتہائی بدبختی زندیقیت اور دشمنی واہانتِ رسول اللہ ﷺ ہے، اگر ''حق گو'' صاحب کے دل میں مرتبۂ رسالت کی عظمت اور انبیاء کی معصومیت ونزاہت کا احساس ہوتا، تو وہ ہرگز اس کی جرأت نہ کرتے کہ اپنے جیسے گناہوں میں ملوّث انسانوں پر انبیاء کو قیاس کر کے ان کے لیے نفسانی خواہشات ثابت کرتے، ہم یہ مان سکتے ہیں کہ لغت میں ''ہویٰ'' کے معنی مطلق خواہش کے ہیں، لیکن اس کے ساتھ نفسانی کا اضافہ غلط ہے، اور خواہش کا نفسانی ہونا ''ہویٰ'' کے مفہوم کا جزو نہیں ہے، لہذا اگر کسی مقام میں محل وقوع کی مناسبت سے ''ہویٰ'' کے معنی خواہش نفسانی کر دیا گیا ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں اس کا موقع نہ ہو، وہاں بھی یہی ترجمہ کر دیا جائے، ''حق گو'' صاحب کو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ یہاں ہویٰ کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے لیے بولا گیا ہے اور رسول نفسانی خواہشوں سے منزہ اور معصوم ہوتا ہے، لہذا اس لفظ کا ترجمہ یہاں نفسانی خواہش کرنا صرف غلط ہی نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی عصمت پر حملہ بھی ہوگا، کیا ''حق گو'' صاحب نہیں جانتے کہ ''مکر'' اور ''خداع'' کے الفاظ ہمارے محاورہ میں کیسے مکروہ معنی میں بولے جاتے ہیں اور ان دونوں کو کفار ومنافقین کی مذمت کے سلسلہ میں قرآن نے استعمال کیا ہے، پھر ان ہی الفاظ کا اطلاق قرآن میں خدا کے لیے بھی ہوا ہے، تو کیا ''حق گو'' صاحب یہاں بھی ان الفاظ کا وہی ترجمہ کریں گے، جو کفر ومنافقین کے ذکر میں کیا جاتا ہے؟ ''حق گو'' صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ''ہویٰ'' کا لفظ عربی لٹریچر میں محبوب ومرغوب شے کے لیے برابر بولا جاتا ہے، ایک شاعر کہتا ہے:

هواي مع الركب اليمانين مصعد　　　جنيب و جثماني بمكة موثق

(میرا محبوب یمنی قافلہ کے ساتھ چلا جارہا ہے اور میرا جسم مکہ میں مقید واسیر ہے)

اب میں چاہتا ہوں کہ حدیث مذکور اور اس میں جس آیت کی طرف اشارہ

ہے، اس کی بھی مختصر سی تشریح کر دوں، تاکہ ''حق گو'' صاحب کی غلط فہمی اور ابلہ فریبی اچھی طرح کھل جائے۔

حدیث زیر بحث اور آیت مذکورہ کی تشریح حدیث و سیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عورتیں زوجیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل کرنے کے لیے بغیر اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی کوئی تحریک یا خواہش کا اظہار ہو، خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتی تھیں کہ: **وَهَبْتُ نفسي لك يا رسولَ الله!** (میں نے اپنے تئیں آپ کے لیے بخش دیا) عورتوں کی اس بات پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو محض فطری حیا و غیرت کی بنا پر تعجب ہوا کہ ایک عورت فطرۃً خواہشِ زوجیت کے اظہار میں بے باک نہیں ہوا کرتی، پھر ان عورتوں کو کیسے ہمت ہوتی ہے؟ کیا ان کو شرم نہیں لگتی؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا برابر اس پر متعجب رہا کرتی تھیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا کہ: ''جو عورت کہ اپنے نفس کو نبی کے لیے ہبہ کر دے، اس کو بھی ہم نے نبی کے لیے حلال کیا، بشرطیکہ نبی اس کو رکھنا چاہے''، تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا تعجب جاتا رہا، اور انھوں نے سمجھ لیا کہ اگر یہ چیز شرعاً قابلِ حیا و شرم ہوتی، تو اللہ تعالیٰ ان عورتوں کو نبی کے لیے حلال کرنے کے بجائے ان کے فعل کی مذمت کرتا، پھر اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار بھی عطا فرمایا، کہ آپ اپنی بی بیوں میں سے جن کو چاہیں چھوڑ دیں یا ان کے لیے باری مقرر نہ کریں، اور جن کو چاہیں اپنے سے ملا لیں آپ کی جو مرضی ہو کریں، اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں دیکھتی ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کی جو مرضی ہوتی ہے، اس کے پورا کرنے میں دیر نہیں کرتا، ایک اسی کو دیکھئے کہ ساری بی بیوں کو رکھنے یا ان سب کے لیے باری مقرر کرنے کو ضروری قرار دیا جاتا، تو ممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی قسم کی کوئی تکلیف یا طبیعت پر گرانی ہوتی، اس لیے اس

معاملہ میں پورا پورا اختیار آپ کو دے دیا کہ آپ کی جو خوشی ہو کیجیے۔ حدیثِ مذکور کی سیدھی اور صاف تشریح یہ تھی، جس کو "حق گو" صاحب اپنی حدیث دشمنی کی وجہ سے نہ سمجھ سکے، اور خواہ مخواہ راوی حدیث پر برس پڑے۔ اب اس کے بعد آیت کو ملاحظہ کیجیے:

يا أيُّها النبيُّ انَّا أحْلَلنا لَكَ أزواجَكَ الّتي اتَيْتَ اُجورَهُنَّ و ما مَلَكَتْ يمينُكَ مما افاءَ اللّٰهُ عليكَ و بنتِ عمّكَ و بناتِ عمّٰتكَ و بنتِ خالِكَ و بنتِ خالاتكَ الّتي هاجَرْنَ مَعَكَ و امرأةً مومنةً اِنْ وَهَبَتْ نفسَها للنبيِّ اِنْ ارادَ النبيُّ أنْ يَسْتَنْكِحَها خالِصةً لَكَ مِنْ دونِ المومِنينَ قد عَلِمْنا ما فرَضْنا عَلَيهم في ازْواجِهِمْ و ما مَلَكَتْ ايمانُهُمْ لِكَيْ لا يكونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ و كانَ اللّٰهُ غفوراً رَّحيماً، تُرجي مَنْ تَشاءُ منهُنَّ و تؤوِي اِلَيْكَ

(یعنی) اے نبی ﷺ ہم نے آپ کے لیے بیبیاں جن کو آپ ان کے مہر دے چکے ہیں حلال کی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو آپ کی مملوکہ ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنیمت میں دلوا دی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کے خالاؤں کی بیٹیاں جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو اور اس مسلمان عورت کو بھی جو اپنے تئیں پیغمبر کے لیے بخش دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہیں، یہ آپ کے لیے مخصوص ہے، نہ اور مومنوں کے لیے (اور مومنوں کے لیے دوسرے کچھ احکام ہیں) ہم کو وہ احکام معلوم ہیں، جو ہم نے ان پر ان کی بیبیوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کیے ہیں اور ہم نے مذکورہ بالا حکم کو صرف آپ کے لیے اس واسطے نافذ کیا) تاکہ آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے، ان (بیبیوں) میں سے آپ جس کو چاہیں اپنے

مَن تشاءُ و من ابتغیت ممن عزلت فلا جناح علیك الآیۃ (احزاب آیۃ ۵۰ و ۵۱)

سے دور رکھیں اور جس کو چاہیں اپنے نزدیک کر لیں اور جن کو دور رکھا تھا ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں، تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس آیت میں صراحۃً مذکور ہے کہ کوئی عورت خود اپنی ذات کو آنحضرت ﷺ کے لیے ہبہ کر دے تو وہ عورت بھی آپؐ کے لیے حلال ہے، بشرطیکہ آپؐ اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں، اور یہ بھی تصریح ہے کہ یہ صورت آپ کے ساتھ مخصوص ہے، پس لازمی طور پر آیت کے اس جزو کا یہی مطلب ہوگا کہ کوئی عورت خود بلا مہر و بلا عوض رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں دیدے اور یہ کہہ دے کہ میں نے اپنے کو آپ کے لیے بخش دیا اور آپ اس ہبہ کو قبول کر لیں، تو یہ بھی نکاح کی ایک صورت ہے، اور وہ عورت رسول اللہ ﷺ کے لیے حلال ہو جائے گی، اور اس کا مہر حضور ﷺ کے ذمہ لازم نہ ہوگا، اور یہ صورت بجز آنحضرت ﷺ کے اور کسی کے لیے جائز نہیں، جو صاحب اس کے علاوہ کوئی مطلب نکالنا چاہیں، وہ آیت کے دو لفظوں پر خصوصیت کے ساتھ غور کریں، اس کے بعد جو مطلب چاہیں بیان کریں:

۱- ایک وھبت نفسھا، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اپنے نفس کو بلا عوض آنحضرت ﷺ کے لیے بخش دے، اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہبہ مفت دینے اور بخشنے کو کہتے ہیں؛

۲- دوسرے خالصۃً لك من دون المومنین، یعنی یہ صورت خالص طور پر آپ کے لیے مشروع ہے، اور مسلمانوں کے لیے نہیں۔ لہذا جو مطلب بیان کیا جائے، وہ ایسا ہو کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے وہ جائز نہ ہو۔

پھر آیت میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ یہ صورت نبی ﷺ کے لیے خاص اس لیے کی گئی تا کہ آپ کو کسی قسم کی تنگی نہ ہو، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حکم کی

مشروعیت آنحضرت ﷺ سے تنگی دفع کرنے کے لیے اور اس لیے ہے کہ آپ رنجیدہ نہ ہوں، بلکہ آپ خوش رہیں۔

اب انصاف سے بتایئے کہ حدیث مذکور میں قرآن مجید سے زائد بات کیا بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں جو اختیارات آنحضرت ﷺ کو عطا فرمائے گئے ہیں، ان کی نسبت قرآن مجید کی مدد سے کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ آپ نے ان سے کوئی فائدہ اٹھایا یا نہیں، ہاں حدیث بتاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مذکورۂ بالا قسم کی کسی عورت کو اپنی زوجیت میں قبول نہیں فرمایا (فتح الباری ۸/۳۷۲ بروایت ابن عباس)

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو علیحدہ نہیں کیا، نہ کسی کی باری بند کی، نہ کسی کی باری کم یا زیادہ کی، خالص مساوات کے اصول پر سب کی باریاں مقرر رہنے دیں (فتح الباری بروایت زہری وقتادہ جلد ۸ صفحہ ۳۷۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیارات حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اختیارات حاصل ہونے کے بعد ان سے فائدہ نہ اٹھاتے، اور یہیں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حدیث مذکور میں ''ہویٰ'' کا ترجمہ خواہشات نفسانی کرنا، خلاف واقع ہونے کے علاوہ سخت بدباطنی اور خبثِ طینت کی دلیل ہے، اس لیے کہ یہاں تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کوئی خواہش تھی ہی نہیں

صاحب سیرتِ حلبی پر افترا چلتے چلتے ''حق گو'' صاحب سیرت حلبی پر بھی ایک افترا کر گئے، ''سیرت حلبی'' میں آنحضرت ﷺ کی خصوصیات میں بلا نکاح عورتوں کا حلال ہونا کہیں بھی مذکور نہیں ہے، ہاں بلفظ ''ھبہ'' نکاح کا منعقد ہونا اور مہر کا واجب الادا نہ ہونا، البتہ خصوصیات رسول اللہ ﷺ میں مذکور ہے، اور یہ خصوصیت قرآن سے ثابت ہے۔

''حق گو'' نے تیسرا عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسحور کیے جاتے ہیں''

اور اس کے ثبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مسحور ہونے کا واقعہ صحاح سے نقل کیا ہے، لیکن اس سے پہلے آپ نے ایک تمہید لکھی ہے، جس میں اپنی قرآن دانی کے ایسے موتی لٹائے ہیں، جن سے اپنے ناظرین کے جیب و دامن کو محروم رکھنا میں پسند نہیں کرتا، فرماتے ہیں:

''قرآن شریف کی سب سے آخر میں جو سورتیں ہیں اور جو ان سے ماقبل ہیں، وہ بالکل تاریخی ترتیب سے لگی ہوئی ہیں (مگر ترتیب الٹی ہے) اول بہت چھوٹی چھوٹی مختصر سورتیں ہیں، جیسے مبتدی کو پہلے چھوٹے چھوٹے جملے پھر طولانی عبارتیں سکھائی جاتی ہیں، خدائے تعالیٰ نے اس اصول فطرت کی بنا پر اپنے برگزیدہ نبی پر وحی نازل کی ہے، اب دیکھو ان سورتوں کے معنی سے کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

ایک جویائے حق تن تنہا بے آب و دانہ (جس کی یادگار میں ہم ہر سال ان دنوں میں روزہ رکھتے ہیں) غارِ حرا میں بیٹھا کائنات کے وجود اور رازِ فطرت کے سمجھنے کے لیے مراقبہ کر رہا ہے، تاریکی و سناٹے میں ایک قسم کا خوف دل میں سما جاتا ہے، کہ وحی کی آواز آتی ہے: قل اعوذ برب الفلق، پھر قل اعوذ برب الناس۔ آنحضرت کا قلب اس سے مطمئن ہوتا ہے اور یکسوئی حاصل ہوتی ہے، تو قل ھو اللہ احد کی آیت اس راز کا انکشاف کرتی ہے جس کے لیے وہ پریشان و سرگرداں تھا، آپ کمر بستہ ہو کر اٹھتے

ہی اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں، بوڑھا بد بخت چچا آپ کا مذاق اڑاتا ہے، آپ دل گرفتہ ہو کر پھر غارِ حرا کا رخ کرتے ہیں، وحی الٰہی آپ کو تسکین دیتی ہے تبت یدا ابی لھب الآیۃ۔ آپ قوی دل ہو کر پھر قوم کے پاس آتے ہیں اور فرمان الٰہی کو قل یا ایھا الکفرون کے الفاظ میں سناتے ہیں اور ان سے ترک موالات کا اعلان کرتے ہیں، کفار کی طرف سے آپ کو ایذائیں دی جاتی ہیں، آپ پھر بے دل ہوتے ہیں، وحی آپ کو آئندہ فتوحات کا نقشہ دکھلاتی ہے اذا جاء نصر اللّٰہ و الفتح الخ۔

''حق گو'' کے شاعرانہ تخیلات ''حق گو'' کے ان عجیب وغریب تخیلات کی داد دیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے تھے، اگر کاش انھوں نے یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ ان کے ان تخیلات کا ماخذ کیا ہے؟ اور ان کے لیے وہ کون سا ثبوت اپنے پاس رکھتے ہیں؟

اگر ''حق گو'' کے پاس کوئی ثبوت و ماخذ نہیں ہے، صرف ان کے تخیلات ہی تخیلات ہیں، تو وہ بتائیں کہ ان کے تخیلات میں کون سا سرخاب کا پَر لگا ہوا ہے کہ مسلمان اسی قبول کریں، اور جو لوگ علم و عقل، فہم و ذکاوت، دین و دیانت میں ''حق گو'' سے بدرجہا بہتر و برتر ہوں، ان کے تخیلات رد کر دیں، اور اگر ''حق گو'' اپنی باتوں کا کوئی ثبوت رکھتے ہوں، تو میرے ان سوالات کا جواب جلد از جلد شائع کر دیں۔

قاہر سوالات ۱- آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن کی آخری سورتوں کی ترتیب بشرطیکہ موجودہ ترتیب کو الٹ دیا جائے، بالکل تاریخی ہے، کیا آپ کسی تاریخ ہی سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ قرآن کی سب سے آخری سورتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں؟

۲- آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آنحضرت ﷺ غارِ حرا میں بے آب و دانہ مراقبہ کیا کرتے تھے؟

۳- تاریکی اور سناٹے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خوف طاری ہونا اور اس کی وجہ سے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس کے نازل ہونے کا ذکر قرآن میں کہیں ہے، یا کسی تاریخ میں، یا محض آپ کا قیاس ہے؟

۴- آپ نے ص ۲۸ میں لکھا ہے کہ:

''قرآن کو الٹ کر تیسواں پارہ پہلا پارہ کر دو ایسا کہ آخری سورہ شروع میں پڑھی جائے اور اس کے بعد اس کے ماقبل کی سورتیں، تو تم کو معلوم ہوگا کہ اٹھائیسویں پارہ تک قرآن کی جو ترتیب کاتبانِ وحی نے لگائی ہے، وہ بالکل تاریخی ہے''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو سورہ نازل ہوئی ہے، وہ قل اعوذ برب الناس ہے، اس لیے کہ موجود ترتیب میں سب سے آخری سورہ وہی ہے، لیکن ص ۵ کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے، اس میں آپ نے تصریح کی ہے کہ پہلے قل اعوذ برب الفلق نازل ہوئی، پھر قل اعوذ برب الناس۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کو قرآن کریم سے کتنا تعلق ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آپ قرآن پاک اٹھا کر کبھی دیکھتے بھی نہیں، اگر کسی بچے سے بھی پوچھ لیتے تو وہ آپ کو بتاتا کہ قرآن کریم کی سب سے آخری سورہ قل اعوذ برب الناس ہے، اگر آپ کہیں کہ میں جانتا ہوں کہ قل اعوذ برب الناس آخری سورہ ہے، لیکن نزول میں وہ دوسرے نمبر میں ہے، لہذا عبارت صفحہ ۵ بالکل صحیح ہے، تو بتائیے کہ ص ۲۸ والی عبارت کی کیا تاویل ہے؟

۵- ان دونوں سورتوں کے نزول سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کا مطمئن ہونا، قل ھو اللہ کے نزول کے بعد قوم کو دعوت دینا، بوڑھے بدبخت چچا کا مذاق اڑانا، ابولہب کا عم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونا، اور آپ کا دل گرفتہ ہو کر غارِ حرا کا دوبارہ رُخ کرنا وغیرہ، قرآن کریم میں تو کہیں مذکور نہیں ہے، پھر یہ باتیں آپ کو کہاں سے معلوم

ہوئیں، کیا قرآن کریم کی تفسیر بالرائے کے ساتھ آپ کو یہ اختیار بھی ملا ہے کہ اپنی عقل وقیاس سے واقعات بھی گھڑ لیں؟

۶-کیا آپ کے قرآن میں قل یا ایھا الکافرون سے پہلے اذا جاء کی سورہ ہے؟ اگر نہیں تو ترتیب الٹنے میں قل یا ایھا الکافرون پہلے اور اذا جاء پیچھے کیسے ہوگئی؟ ''حق گو'' صاحب اپنا کام کیجئے، ان مباحث میں پڑ کر اپنی قرآن دانی کو کیوں رسوا کرتے ہیں۔

۷-سوال نمبر ا ونمبر ۲ ونمبر ۳ وغیرہ کا جواب یا تو قرآن سے دیجئے، یا کم از کم تاریخ سے، لیکن تاریخ سے جواب دینے کی صورت میں یہ بتانا ہوگا کہ جب تاریخ و حدیث دونوں کا مدار روایت ونقل پر ہے، تو تاریخ معتبر اور حدیث نامعتبر کیوں ہوگئی؟ حالانکہ حدیث کی روایتی حیثیت تاریخ سے بہت زیادہ مستحکم اور ٹھوس ہے۔

تاریخی واقعات قیاس سے ثابت نہیں ہوسکتے مجھے حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب باایں ہمہ ادعاء ہمہ دانی اب تک یہ نہیں جانتے کہ تاریخ قیاس کی دسترس سے باہر ہے، تاریخی واقعات یا کسی کے حالاتِ زندگی محض قیاس سے بیان نہیں کیے جا سکتے، بلکہ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس شخص کا زبانی یا تحریری بیان بلا واسطہ یا بواسطہ نقل در نقل پیش کیا جائے، جس نے ان واقعات وحالات کا مشاہدہ کیا ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر شخص کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنے قیاس سے جس عہد کی چاہے، تاریخ مرتب کر لے، اور جس شخص کے حالاتِ زندگی اپنے تخیل سے جس طرح چاہے لکھ دے۔

حدیثِ سحر پر ''حق گو'' کے اعتراضات اتنی گزارش کے بعد سنئے کہ ''حق گو'' صاحب آنحضرت ﷺ کے مسحور ہونے کے واقعہ کو ان وجوہ سے غلط قرار دیتے ہیں:

۱-اگر یہ واقعہ صحیح ہو تو ان کفار کی تصدیق ہوتی ہے، جو آپ کو بطور

اتہام کے ساحر و مسحور بتاتے تھے۔

۲- کیا سردار انبیاء کی یہی شان ہے کہ آپ پر یہودی کا جادو چل جائے۔

۳- یہ واقعہ مدینہ کا حضرت عائشہؓ اپنے زمانے کا بیان کرتی ہیں، تو کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ اس کا تعلق سب سے ابتدائی مکی سورتوں سے کیسے گھڑ لیا گیا۔

۴- اس واقعہ کی تردید و تکذیب قرآن شریف کی یہ آیتیں کر رہی ہیں،
و قال الکافرون ان تتبعون الا رجلا مسحوراً و ما انت بنعمة ربك بكاهن و لا مجنون، و النجم اذا هوى ما ضل صاحبكم و ما غوىٰ"

جوابات لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی وجہ بھی صحیح اور واقعۂ سحر کی تغلیط و تکذیب کے لیے کافی نہیں ہے، میں "حق گو" صاحب کی غلط فہمیوں کو ظاہر کرنے کے لیے ہر وجہ کا علیحدہ علیحدہ جواب لکھتا ہوں:

حضور کو مسحور کہنے سے کفار کا کیا مقصد تھا پہلی وجہ کا جواب یہ ہے کہ "حق گو" صاحب نے بالکل غور نہیں کیا کہ کفار کا اتہام کیا تھا، اگر وہ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھے ہوتے، تو ان کو معلوم ہوتا کہ مشرکین مکہ نے آنحضرت ﷺ کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کے لیے مختلف راہیں اختیار کی تھیں، کوئی یہ کہتا تھا کہ محمد (ﷺ) کی عقل میں کچھ فتور نہیں ہے، انھوں نے جان بوجھ کر خدا پر افترا کیا ہے (معاذ اللہ)، اور کوئی کہتا تھا کہ نہیں ان کی عقل میں فتور ہے، اور وہ (خاک بدہن دشمناں) دیوانہ ہو گئے ہیں، اور ان کا دعویٰ نبوت نتیجۂ جنون ہے، قرآن پاک میں ہے: ﴿اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ﴾ (یا انھوں نے جان بوجھ کر خدا پر افترا کیا ہے یا ان کو جنون ہے) اور کوئی بد

بخت بجائے مجنوں کہنے کے آپ کو مسحور کہتا، لیکن منشا اس کا وہی تھا کہ آپ مجنون ہیں، کسی نے آپ کی عقل پر جادو کر دیا ہے، جس کی وجہ سے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا ہے، کفارِ مکہ کہنے کو یہ سب کچھ کہتے تھے، لیکن وہ خود بھی سمجھتے تھے کہ آپ کا دامن ان تہمتوں سے بالکل پاک ہے، اور تاریخ شاہد ہے کہ ان میں کے بہت سے صاحبانِ عقل و دانش نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے، اور واقعات نے بھی ان کے اتہامات کی لغویت دنیا پر ظاہر کر دی ہے؛ بہر حال کفار کے اتہام کا منشا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ آپ کے دماغ میں خلل اور عقل میں فتور ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ اتہام صرف کفار مکہ لگایا کرتے تھے، چنانچہ اس اتہام کا ذکر قرآن پاک کی صرف مکی سورتوں میں ہے، مدینہ میں جو آپ کے مخالفین تھے، ان میں سے کسی نے کبھی یہ اتہام نہیں لگایا۔

سحر کا اثر حضور کی عقل اور قوتِ ادراک ویقین پر قطعاً نہیں ہوا اس تمہید کے بعد سنیئے کہ حدیث میں آنحضرت ﷺ پر جادو کیے جانے کا جو واقعہ مذکور ہے، وہ مدنی زندگی کا واقعہ ہے، اور مورخین نے تصریح کی ہے کہ یہ ۷ھ میں پیش آیا، دوسرے خود حدیث میں یہ تصریح موجود ہے کہ سحر کا صرف اتنا اثر آپ پر ہوا تھا کہ آپ کو خواہ مخواہ شبہہ پیدا ہو جاتا، کہ بی بی سے مقاربت کی ہے، حالانکہ آپ کو یقین ہوتا تھا کہ بی بی کے پاس گئے بھی نہیں ہیں، اور کھانا نہیں کھایا جاتا تھا، اور آنکھوں سے کچھ کم نظر آتا تھا؛ غرض یہ ہے کہ سحر کا اثر آپ کی عقل اور قوت ادراک و یقین پر بالکل نہیں ہوا تھا، پس ظاہر ہو گیا کہ کفار مکہ کے اتہام کی اس واقعہ سے قطعاً تائید نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس اتہام کا مقصود تو یہ تھا کہ (معاذ اللہ) آنحضرت ﷺ کا دماغ ماؤف اور عقل میں خلل ہے، اور حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے، اس سے فتور عقل یا خلل دماغ نہیں ثابت ہوتا، بلکہ دوسرے عوارض جسمانی ثابت ہوتے ہیں، نیز کفار کی تائید اس

واقعہ سے اس لیے بھی نہیں ہو سکتی، کہ کفار یہ اتہام مکہ میں لگایا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ آپ پر جادو کیا گیا ہے، اور اس وجہ سے آپ کے دماغ میں خلل پیدا ہو گیا، اور دعویٰ نبوت اسی خللِ دماغ کا نتیجہ ہے، حالانکہ زمانہ قیام مکہ میں جس کی مدت تیرہ سال ہے، کبھی اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، پھر مدنی زندگی میں بھی پورے چھ سال تک کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، پس اس واقعہ سے جو ۷ھ میں یعنی دعویٰ نبوت کے ۱۹ سال بعد ہوا، اس سے اتہام مذکور کی کیوں کر تائید ہو سکتی ہے؟ کیا ''حق گو'' صاحب کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ اتہام مذکور کی واقعیت اور کفار کی صداقت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اتہام لگانے کے وقت آپ مسحور ہوتے، اور کفار کی تائید صرف ایسے واقعہ سے ہو سکتی ہے جو اس وقت آپ کا مسحور ہونا ثابت کرے؟ باقی وہ واقعہ جو دعویٰ نبوت کے ۱۹ر سال بعد ہوتا ہے، اس سے کوئی تائید نہیں نکلتی، اور نہ وہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے انکار کرنے کے لیے حجت بن سکتا ہے، اس لیے کہ اس صورت میں کفار سے پوچھا جائے گا، کہ اگر تم دعویٰ نبوت کو سحر کا اثر کہتے ہو، تو سحر تو ۱۹ر سال کے بعد ہوا، لہذا بتاؤ کہ ۱۹ سال تک کس اثر کے ماتحت آپ دعوائے نبوت کرتے رہے، اور تم ۱۹ سال تک آپ کو مسحور قرار دے کر کیوں جھوٹ بولتے رہے، کیا ''حق گو'' صاحب کفار کے وکیل بن کر اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر نہیں دے سکتے ہیں تو کیوں کہتے ہیں کہ اس واقعہ سے کفار کی تائید ہوتی ہے؟

سحر کا اثر علاوہ سطحی ہونے کے عارضی تھا حاصلِ کلام یہ کہ کفار جس وقت آپ کو سحر کے ساتھ متہم کرتے تھے، اس وقت بلکہ اس کے مدتوں بعد تک آپ مسحور نہیں ہوئے، اور جب آپ پر سحر کیا گیا، تو اس کا اثر آپ کی عقل وقوتِ ادراک و یقین پر مطلق نہ ہوا، حالانکہ کفار کے مسحور کہنے کا یہی مقصد تھا کہ (معاذ اللہ) آپ کا دماغ ماؤف تھا، پھر اس سحر کا اثر بھی آپ پر بنا بر قول اصح صرف تین دن یا چار دن تھا، اس

کے بعد بالکل زائل ہو گیا، لہذا اس سے کفار کی کچھ تائید نہیں ہوتی۔

واقعۂ سحر حضورؐ کے نبی ہونے کی روشن دلیل ہے بلکہ ''حق گو'' صاحب کے علی الرغم یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی ایک روشن دلیل ہے، غور کیجئے کہ مدینہ سے دو سو میل کے فاصلہ پر آپ پر سحر کیا جاتا ہے، اور جادوگر یہودی کی بہن کہتی ہے کہ اگر آپ نبی ہوں گے، تو منجانب اللہ آپ کو اطلاع ہو جائے گی، اور اگر اپنے دعویٰ میں کاذب ہوں گے، تو ان کو کچھ پتہ نہ چلے گا، تا آنکہ ان کی عقل جاتی رہے گی، حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتا دیا جاتا ہے کہ کس نے جادو کیا، اور کہاں کیا، اور اس کے دفعیہ کی کیا صورت ہے، اور اس اطلاع کے ذریعہ ظاہر کر دیا جاتا ہے کہ آپ سچے ہیں۔

ساحر کی ناکامی ونامرادی دوسری وجہ تکذیب واقعہ کی پہلے سے بھی عجیب ہے، یہود کا جادو چلا کہاں؟ اس نے چاہا تھا کہ آپ کی عقل جاتی رہے، لیکن اس کی ہوس پوری نہ ہوئی، اور نبی ﷺ کی عقل پر کچھ اثر نہ ہوا، اور جو اثر ہوا، وہ فقط جسمانی عوارض کی شکل میں ہوا، اور انبیاء جسمانی عوارض وامراض سے منزہ نہیں ہیں، دیکھئے خدا نے حضرت ابراہیمؑ کا مقولہ قرآن میں نقل فرمایا ہے:

﴿اِنِّیْ سَقِیْمٌ﴾ (میں بیمار ہوں)

اور فرمایا:

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ﴾ یعنی یاد کیجئے ہمارے بندے ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھ کو شیطان نے بیماری کی تکلیف اور عذاب پہنچایا۔

انبیاء عوارض جسمانی سے مبرا نہیں ہوتے معلوم ہوا کہ انبیاء بیماریوں سے مبرا نہیں ہوتے، اگر کہیئے کہ انبیاء طبعی طور پر بیمار ہو سکتے ہیں، لیکن کفار ومخالفین دین

کے ہاتھ سے ان کو کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، تو یہ بھی غلط ہے، قرآن نے متعدد مقامات میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے:

﴿یَقْتُلُوْنَ النَّبِیِّیْنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ﴾ یعنی یہودیوں نے بہتیرے نبیوں کو ناحق قتل کر دیا،

اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے کفار کے ہاتھوں سے بڑی بڑی اذیتیں اٹھائیں، سرِ مبارک زخمی ہوا، دندانِ مبارک شہید ہوا، اور ڈھیلوں اور پتھروں سے جسم شریف لہولہان ہو گیا، پس جب یہ عوارض انبیاء علیہم السلام کے جسم پر کفار و مخالفین کے ہاتھوں سے طاری ہو سکتے ہیں، تو یہودیوں کے سحر سے جو عوارض طاری ہوئے، وہ کیوں ناممکن معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی تو امراض و اسقام اور عوارض جسمانی ہی ہیں، ہاں! انبیاء کرام علیہم السلام اس بات سے بیشک معصوم و منزہ ہیں کہ کوئی مخالف ان کے عقائد میں تبدیلی پیدا کر دے، یا ان سے خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرا دے، یا کسی نوع سے ان کو بہکا دے، یہ سب باتیں قطعاً ناممکن ہیں، اور اس معنی کے لحاظ سے کسی یہودی، نصرانی، مجوسی یا مشرک کا جادو سید الانبیاء ﷺ بلکہ کسی نبی پر نہیں چل سکتا۔

''حق گو'' کا جہل اور تیسری وجہ اور بھی عجیب ہے، ''حق گو'' صاحب محض اپنے تخیل سے معوذتین کو سب سے پہلی مکی سورتیں قرار دے کر پوچھنے لگے کہ ''سحر کا واقعہ تو مدینہ کا ہے، پھر اس کا تعلق ان سورتوں سے کیسے گھڑ لیا گیا''؟ اے جناب! معوذتین کو مکی سورتیں کہتا کون ہے، یہ سورتیں تو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، واقعۂ سحر کے علاوہ اور احادیث سے بھی ان کا مدنی ہونا ثابت ہے، اور اس کے علاوہ دنیا میں جتنے قرآن ہیں، چاہے وہ جس فرقہ اسلامی کے لکھوائے اور چھپوائے ہوئے ہوں، سب میں ان دونوں کو مدنی ہی لکھا ہے، لہذا آپ سے یہ سوال ہے کہ آپ ان کو مکی کس

دلیل کی بنا پر کہتے ہیں، آپ کے تخیل و توہم و قیاس ورائے کے سوائے کوئی دلیل ہو تو پیش کیجئے، اس لیے کہ کسی سورۃ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی، ایک تاریخی واقعہ اور ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر کی ایک بات ہے، اس میں قیاس کو دخل نہیں ہوسکتا، لہذا کسی ایسے شخص کا بیان پیش کیجئے جس نے اس واقعہ کا مشاہدہ کیا ہو، یا جو اس وقت موجود رہا ہو، ہم ایسے ہی مستند تاریخی بیان کی بنا پر اس کے قائل ہیں کہ یہ سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں، ثبوت کے لیے حضرت عقبہ بن عامرؓ صحابی رسول ﷺ کا بیان ترمذی (ص۴۱۲) مسلم (۲۷۲/۱) میں دیکھئے۔

سورۂ فلق اور واقعۂ سحر نیز آپ کا خیال ہے کہ جب غار حرا میں تنہائی اور سناٹے کی وجہ سے آپ پر خوف طاری ہوا، تو یہ سورتیں نازل ہوئیں، لہذا بتائیے کہ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر خوف طاری ہوا، یہ کس تاریخ میں مذکور ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ سورۂ فلق میں یہ جو مذکور ہے کہ

﴿و مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ﴾ یعنی میں پناہ مانگتا ہوں گرہوں میں پھونکنے والی عورتوں کے شر سے۔

اس کا کیا مطلب ہے؟ اور اس کو حرا میں خوفزدہ اور متوحش ہونے کے (فرضی) واقعہ سے کیا تعلق ہے؟ اور کیا گرہوں میں پھونکنا سحر و جادو کا کنایہ نہیں ہے؟ اور کیا اس سے مفہوم نہیں ہوتا، کہ نبی پر بھی سحر کا اثر بصورت عوارض جسمانی ہوسکتا ہے؟ اس لیے کہ اگر اثر ہونا محال ہوتا، تو اس سے پناہ مانگنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

''حق گو'' کی قرآن مجید سے بے تعلقی بہر حال سورۂ فلق کا یہ فقرہ خود دلیل ہے کہ اس سورہ کا تعلق واقعۂ سحر سے ہے۔ چوتھی وجہ تکذیب واقعہ کی پہلی تمام وجہوں سے، بہت زیادہ عجیب اور قرآن کریم سے آپ کی بے تعلقی کی بین دلیل ہے، آپ کی پیش کردہ تین آیات میں سے کسی میں بھی یہ مذکور نہیں ہے، کہ انبیاء پر سحر کا اثر بصورت

عوارض جسمانی محال ہے، لہذا میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان آیات سے واقعۂ سحر کی کس طرح تکذیب ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پہلی آیت میں یہ دیکھ کر کہ مخالفین نے آنحضرت ﷺ پر مسحور ہونے کی تہمت لگائی ہے، پس اگر واقعۂ سحر صحیح ہو، تو اس سے مخالفین رسول اللہ ﷺ کے اتہام کی تائید ہوگی، یہ لکھ مارا؛ لیکن میں مخالفین کے مسحور کہنے کا مقصد اور اس اتہام کی تاریخ ذکر کر کے ثابت کر چکا ہوں کہ واقعۂ سحر سے ان کے اتہام کی کسی طرح تائید نہیں ہوتی، رہی دوسری اور تیسری آیت تو ان میں آنحضرت ﷺ سے جنون اور گمرہی کی نفی کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ جنون کا تعلق عقل و دماغ سے اور گمراہی کا تعلق اعتقاد و علم سے ہے، اور میں ثابت کر چکا ہوں کہ سحر کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی عقل شریف و دماغ عالی میں نہ کوئی فتور پیدا ہوا، اور نہ آپ کے اعتقادات و علوم پر اس کا کوئی اثر پڑا تھا، لہذا ان آیات کے خلاف کوئی بات واقعۂ سحر میں نہیں ہے، پس ان آیات کو واقعۂ سحر کی تکذیب کے لیے پیش کرنا آپ ہی کہیے کہ حماقت ہے یا نہیں۔

''حق گو'' کا جدید قرآن اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب سے پوچھوں گا کہ وقَالَ الکٰفِرونَ اِنْ تَتَّبِعونَ اِلَّا رجلاً مسحوراً کس پارے کی آیت ہے، ہم نے قرآن کریم کے جتنے نسخے دیکھے ہیں ان میں وقَالَ الظّٰلِمونَ ہے، افسوس ہے کہ آپ کو اتنا بھی تعلق قرآن سے نہیں ہے، کہ اس کو صحیح لکھ یا پڑھ سکیں۔

''حق گو'' صاحب نے چوتھا عنوان یہ رکھا ہے:

شیطان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و منہ میں جگہ پاتا ہے (نعوذ باللہ)

اور اس عنوان کے ماتحت لکھا ہے:

''الم نشرح لك صدرك کی تفسیر میں شق صدر کی روایت حدیث پڑھو اور تلک الغرانیق العُلی کی تفسیر جس کی تصدیق علماء مستند کر رہے ہیں''

پھر بطور طنز کے یہ بھی لکھا ہے:

''مگر راوی نے ربِّ اشرح لی صدری کی دعائے موسیٰ میں حضرت موسیٰ کے شق صدر کی روایت بیان نہ کی''

''حق گو'' صاحب کا مطلب یہ ہے کہ شق صدر کی بعض روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ فرشتہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبِ مبارک چاک کر کے اس میں خون کی ایک پھٹکی نکالی، اور کہا ''یہ شیطان کا حصہ تھا''، لیکن اس روایت کی بنا پر مذکورۂ بالا عنوان قائم کر کے حدیث سے بدظن کرنا ''حق گو'' صاحب کی کج فہمی یا ابلہ فریبی ہے، اس لیے کہ صحیح مسلم کی جس روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں، اس میں صراحتہً یہ بھی مذکور ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالکل کمسن اور بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، یعنی قبل از نبوت بلکہ قبل از بلوغ کا واقعہ ہے (دیکھو مسلم ۹۲/۱، اور شرح شفا ۲۰۲/۲)۔

پس بچپن کے واقعہ کو نبوت کے بعد کا واقعہ ظاہر کرنا کتنی بڑی بددیانتی ہے، پھر یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں خیر و شر، نیکی و بدی اور تقویٰ و فجور کا مادہ ودیعت رکھا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىہَا فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا﴾ اور فرمایا﴿وَ ہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ﴾ اور چونکہ انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں، لہذا اصل فطرت انسانی کے تقاضا سے ان میں بھی ابتداء عمر میں سب قوتیں موجود ہوتی ہیں، جو دوسرے انسانوں میں ہوتی ہیں، مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام گمراہوں کو راہ پر لگانے، اور بدکاروں کو نیکوکار بنانے اور دلوں کی گندگیوں کو دور کرنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، اس لیے بعثت بلکہ بلوغ سے پہلے ہی ان کے قلوب سے مادۂ فجور نکال کر پھینک دیا جاتا ہے، اور برائی کی طرف جو قوت مائل کرنے والی ہے، اس کو بالکل نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔

معجزۂ شق صدر | شق والی روایت میں یہی بیان ہے کہ وہ مادہ جس کا خاصہ بدی کی جانب مائل کرنا ہے، اور جس کی وجہ سے شیطان کی مرضی کے موافق کام صادر ہوتے ہیں، اس مادہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے نکال کر پھینک دیا گیا، اور نبوت بلکہ بلوغ سے بہت پہلے بچپن ہی میں قلبِ شریف کو شیطانی تصرفات اور شیطانی وساوس و خطرات سے مامون و مصؤن کر دیا گیا، اور اصل فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بدی کی طرف جو میلان ممکن تھا، اس کے دھبے دھو کر قلبِ مبارک کو صاف ستھرا اور آئینہ کی طرح روشن و شفاف بنا دیا گیا، یہ حدیثِ شقِ صدر کا روشن مفہوم ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک کو شیطانی تصرفات سے بالکلیہ صاف و پاک ثابت کرنا چاہتی ہے، مگر ''حق گو'' کو حدیث کی دشمنی میں اس کا الٹا اثر نظر آتا ہے، سچ ہے: ع

گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

رب اشرح لی صدری کی تفسیر میں راویوں کا موسیٰ علیہ السلام کے شق صدر کا ذکر نہ کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ شقِ صدرِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت جعلی نہیں ہے، اس لیے کہ اگر جعلی ہوتی تو جہاں جہاں شرح صدر کا لفظ ہوتا، وہاں وہاں

ایک روایت بنالی جاتی، مگر چونکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ راوی واقعات کا پابند ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ کے شق صدر کا ذکر کرتا ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شق صدر کا ذکر نہیں کرتا کہ واقعہ یوں نہیں ہے۔

تلک الغرانیق العُلیٰ پر بحث حدیثِ شقِ صدر کے بعد "تلک الغرانیق العُلی" والی جس روایت کی طرف "حق گو" نے اشارہ کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک بار سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، جب ﴿وَ مَنٰوۃَ الثَّالثۃ الاُخریٰ﴾ پر پہنچے، تو کسی شیطان نے یہ کلمات شرارت سے بک دیے، **تلک الغرانیق العلی و ان شفاعتھن لترتجی**، اس روایت کو غور سے پڑھئے اور بتایئے کہ ان کو "حق گو" صاحب کے مدعیٰ سے کیا تعلق ہے؟ اس میں یہ کہاں مذکور ہے کہ شیطان نے آنحضرت ﷺ کے دہن مبارک میں یہ کلمات ڈالے تھے، پھر اس روایت کا حوالہ دے کر مذکورۂ بالا عنوان قائم کرنا صریح فریب کاری ہے یا نہیں؟ تلاوتِ قرآن کے وقت کفار و مشرکین کی اس قسم کی شرارتوں کا ذکر تو خود قرآن کریم میں موجود ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾

یعنی کافروں نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کی تلاوت کے وقت گڑبڑ مچاؤ، شور و غوغا کرو شاید تم غالب آجاؤ۔

اسی مضمون کا ذکر اوپر والی حدیث میں بھی ہے۔

اس کے بعد سنئے کہ جن علماء نے اس روایت کی تصدیق کی ہے، وہ صرف اتنے مضمون کی تصدیق کرتے ہیں، دیکھو فتح الباری (۸/۳۰۷) اور شرح شفا (۲/۳۳۵) باقی یہ مضمون کہ شیطان نے یہ کلمات آنحضرت ﷺ کی زبان پر سہواً یا نیند کی حالت میں جاری کرا دیے، تو اس کا علماء نے سخت انکار کیا اور بڑے شد و مد سے اس کی

تغلیط وتکذیب کی ہے (دیکھو فتح ۳۰۷/۸ وشرح شفا ۳۳۵/۲، ناسخ ومنسوخ ص ۱۹۰ و ۱۹۱ وغیرہ)۔ مولوی شبلی صاحب نعمانی نے ''سیرۃ النبی'' جلد اول میں اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، اس کا ماحصل وہی ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔ ''حق گو'' صاحب نے اپنے ناظرین کو ''سیرۃ النبی'' کا یہ مقام دیکھنے کا مشورہ دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بحث کو اس میں پڑھ چکے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ اس کے بعد ان کو سطورِ بالا لکھنے کی کیوں کر جرأت ہوئی۔

"حق گو" صاحب نے پانچواں عنوان یوں ذکر کیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکر و خدع سے اپنے دشمنوں کو قتل کرادیتے تھے

اور اس سرخی کے نیچے کعب بن الاشرف یہودی کے قتل کا واقعہ نقل کر کے لکھا ہے:

"میرے نزدیک آنحضرت کی ذاتِ مبارک پر راوی نے ایک بدترین اتہام لگایا ہے، یقیناً نہ آپ اس قتل کے محرک تھے نہ آپ کو اس کا علم تھا، کعب کو اس کے کسی عرب دشمن نے اپنے ذاتی عناد کی وجہ سے یا اس کی بعض بد کرداریوں کی پاداش میں قتل کر دیا ہوگا، اور چونکہ وہ آنحضرت کی نسبت فتنہ انگیزی کر رہا تھا، اس لیے دشمنانِ دین نے قتل کی تہمت آپ کے سر لگا دی"

"حق گو صاحب اگر اپنے اس بیان پر کوئی کمزور سے کمزور تاریخی شہادت بھی پیش کر دیتے، تو ہم کو ان سے کوئی وجہِ اختلاف نہ تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بے دلیل اور بے ثبوت، پھر ہم کو حیرت ہے کہ جب وہ کعب کو بدکردار تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فتنہ انگیز بھی تھا، تو ایسے بدکرداروں اور فتنہ انگیزوں کے قتل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر کون سا اعتراض پڑ سکتا ہے، کیا مہذب سے مہذب حکومتیں فتنہ انگیزوں کے ساتھ یہی برتاؤ نہیں کیا کرتیں؟ کیا قرآن میں ﴿الفتنۃُ اشدُّ من القتلِ﴾ یعنی فتنہ انگیزی کو قتل سے زیادہ سخت اور برا نہیں فرمایا ہے؟ کیا قرآن میں فتنہ پردازوں کی نسبت یہ حکم نہیں ہے: ﴿وَ قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ یعنی ان سے لڑو یہاں تک فتنہ باقی نہ رہے؟ کیا کعب وہی

شخص نہیں ہے، جس کی بابت مورخین یک زبان ہو کر بیان کرتے ہیں کہ وہ بدر کے مشرکین مقتولین کے نہایت پُر درد مرثیے لکھ کر مکہ لے گیا، اور مشرکینِ مکہ کو انتقام کے لیے برانگیختہ کیا(۱)، اور حرم کا پردہ پکڑوا کر اس کے لیے معاہدہ کرایا(۲)، قصیدوں میں آنحضرت ﷺ کی خوب توہین کی(۳)، مسلمان شریف خاتونوں کا نام لے لے کر اظہارِ تعشق کیا، اور ان کی بے حرمتی کی(۴)، آنحضرت ﷺ کو خفیہ قتل کرا دینے کی سازش کی(۵)، اور کفار قریش وغیرہ کو آنحضرت ﷺ کے قتل کے لیے ابھارا(۶)، اور آنحضرت ﷺ کی دعوت کر کے کچھ لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ تشریف لائیں، تو دھوکہ سے آپ کو ہلاک کر دیں(۷)؟ اور کیا کعب اس قوم کا رئیس و سردار نہیں ہے، جس نے خود انصار کے دو قبیلوں اوس وخزرج کو لڑا کر اہل اسلام کی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہا تھا(۸)؟ پھر اگر ایسے ننگِ انسانیت وجود سے زمین پاک کر دی گئی، تو اس میں کیا قباحت ہے؟ کعب صرف آنحضرت ﷺ ہی کا دشمن نہیں تھا، بلکہ تمام انصار اور کفار قریش کا بھی دشمن تھا، اس نے اپنے خبثِ باطن سے سب کو عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، پس اس کو زندہ رہنے دینا ہی بڑا ظلم تھا، نہ کہ اس کا قتل کر دینا۔

اس روایت پر ''حق گو'' صاحب کی جرح اور اس کا جواب اس کے بعد ''حق گو'' صاحب اس واقعہ کی روایت پر جرح کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

''اول سوال تو یہ ہے کہ محمد بن مسلمہ (قاتلِ کعب مذکور) کون شخص تھے؟ اگر صحابی تھے اور یقیناً جیسا کہ روایت سے ظاہر ہے کہ صحابی تھے تو خود ان کی روایت ہم

(۱) سیرت ابن ہشام ۱۲۔ (۲) فتح الباری ص ۲۳۷، خمیس ص ۵۱۷

(۳) ابوداود و ترمذی، فتح ص ۲۳۶ (۴) فتح الباری ص ۲۳۶، ۱۲ (۵) تاریخ یعقوبی ۱۲

(۶) ابن سعد و ابوداود ۲/۲۱ (۷) فتح ۲۳۷ (۸) اصابہ ۱/۸۸، ۱۲۔

تک براہِ راست بغیر ایک دوسرے صحابی کی سند کے کیوں نہیں پہنچی؟ کیوں حضرت جابر کو بیچ میں ڈالا گیا؟''

سبحان اللہ کیا جرح ہے! اولاً تو ہم ''حق گو'' صاحب کو بتانا چاہتے ہیں کہ یہ محمد بن مسلمہ کی روایت نہیں ہے، بلکہ ان کا ایک فعل اور ایک واقعہ ہے، جس کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے، اور اس واقعہ کے وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ خود موجود تھے، بہتر ہوگا کہ آپ صحیحین پر ایک نگاہ پھر ڈال لیئے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ حضرت جابرؓ محمد بن مسلمہ کا بیان نہیں نقل کر رہے ہیں، دوسرے اگر بالفرض حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہی نقل کیا ہوتا، تو اس میں کیا قباحت تھی؟ حضرت جابرؓ سن میں محمد بن مسلمہ سے بہت چھوٹے تھے، اور کمسن صحابہ بڑی عمر والے صحابہ سے برابر روایت کرتے ہیں، اور صحابہ پر کیا موقوف ہے، آج بھی ایک مشہور استاذ کے قدیم و معمر شاگردوں سے اس کے نوجوان اور کم سن شاگردوں کے پڑھنے کی صدہا نظیریں موجود ہیں، پس اسی طرح حضرت جابرؓ باوجود شاگردِ رسول ﷺ ہونے کے محمد بن مسلمہؓ کے شاگرد بھی ہو سکتے ہیں، اور چونکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پینتیس سال پہلے فوت ہوئے ہیں، اس لیے عمرو بن دینار ان سے براہِ راست اس کو نہ سن سکے، بلکہ حضرت جابرؓ سے اس کی روایت کی، محمد بن مسلمہ کی وفات ۴۳ھ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وفات ۷۸ھ میں ہوئی (زرقانی ۲/۸ اور تذکرۃ الحفاظ)۔

پس ''حق گو'' صاحب کا محمد بن مسلمہؓ کے حضرت جابرؓ سے پہلے وفات پانے کا انکار کرنا، جہالت اور بے خبری ہے، اور اگر ''حق گو'' صاحب کا یہ خیال ہے کہ اس واقعہ کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کیوں بیان کیا؟ محمد بن مسلمہ کو بیان کرنا چاہئے، تو میں ان سے پوچھوں گا کہ یہ کہاں کا اصول ہے کہ جو واقعہ جس شخص سے تعلق رکھتا ہو،

اس کو وہی شخص بیان کرے تو قبول کیا جائے گا، ورنہ نہیں؛ اگر ''حق گو'' صاحب کا یہی اصول ہے تو پھر ان کے نزدیک سارا ذخیرۂ تاریخ نا معتبر اور بے کار ہوگا، اس لیے کہ عموماً تاریخوں میں جن اقوام واشخاص کے حالات لکھے گئے ہیں، وہ خود ان کے بیان کیے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے دیکھنے والوں کے بیانات ہیں، بہر حال یہ نہایت لغو جرح ہے، جس سے روایت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ خصوصاً جب کہ یہ واقعہ دوسرے طریق سے بھی ثابت ہے، چنانچہ حاکم نے مستدرک میں اس کو محمد بن ابی عبس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ذکر کیا ہے، حضرت ابو عبس بھی کعب مذکور کے قتل میں شریک تھے، یہ محمد بن ابی عبس ان ہی کے لڑکے ہیں، اور ابو داود و ترمذی نے عبداللہ بن کعب بن مالک کی روایت سے بھی ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ اور طریقوں سے بھی یہ واقعہ مروی ہے۔

''حق گو'' صاحب کی دوسری جرح اس کے بعد ''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

> ''دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن مسلمہ پیدائشی مسلمان تھے، یا خود ایمان لائے تھے، بہر صورت ان کا آنحضرت کا ہم نام ہونا عجب معنی رکھتا ہے، کیوں کہ عرب میں آنحضرت سے پہلے محمد کسی کا نام نہیں رکھا گیا اور عرصہ تک آنحضرت کے اسم مبارک پر لوگ فرطِ ادب سے نام رکھنا جائز نہ رکھتے تھے''۔

جواب ''حق گو'' صاحب کی قلتِ معلومات کا یہ حال ہے کہ وہ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا کچھ حال نہیں جانتے، پہلے سوال میں بھی انھوں نے اس سے بے علمی کا اظہار کیا ہے، اور اس سوال میں بھی، حالانکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بہت مشہور صحابی ہیں، اور وہ آنحضرت ﷺ کے قدوم مدینہ سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ایمان لا چکے تھے(۱)، بعثت سے بائیس سال پہلے پیدا ہوئے اور

(۱) مستدرک حاکم ص ۴۳۴ ج ۳، ۱۲ منہ

۴۳ھ میں وفات پائی (۱)۔

بے علمی کا دوسرا مظاہرہ ان کا یہ لکھنا ہے کہ:

''عرب میں آنحضرت سے پہلے کسی کا نام محمد نہیں رکھا گیا''

حالانکہ آنحضرت ﷺ کی ولادتِ شریفہ سے کچھ پہلے بیس آدمیوں کا محمد نام رکھا گیا، اور ولادت کے بعد بھی یہ نام رکھا گیا، جن ایک محمد بن مسلمہ بھی ہیں (دیکھو فتح الباری ۶/۳۵۸) ہاں یہ صحیح ہے کہ ابتدائے آفرینشِ عالم سے لے کر ولادتِ شریفہ سے کچھ پہلے تک کسی کا یہ نام نہیں رکھا گیا، لیکن جب عرب میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ نبی آخر الزماں کا زمانہ اب قریب ہے اور ان کا نام محمد (ﷺ) ہوگا، تو بہت سے لوگوں نے اس توقع میں کہ شاید یہ دولت ہمارے ہی حصہ میں آئے، اپنے لڑکوں کو اس نام سے موسوم کیا (۲)۔

''حق گو'' صاحب کا یہ کہنا کہ:

''عرصہ تک فرطِ ادب سے یہ نام نہیں رکھا جاتا تھا''

بالکل صحیح ہے، مگر یہ آپؐ کے مبعوث ہونے کے بعد کا واقعہ ہے، اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا یہ نام بعثت سے پہلے رکھا گیا ہے، باقی اس کے ثبوت ہونے میں صحیح مسلم کی جو حدیث انھوں نے نقل کی ہے، وہ ان کے مدعا کے خلاف ہے، اس لیے کہ اس میں آنحضرت ﷺ نے صراحتاً اجازت دی ہے، کہ میرا نام رکھو مگر میری کنیت نہ رکھو۔

''حق گو'' صاحب کی تاریخ دانی اس کے بعد ''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

''کعب کا واقعہ قتل بدر کے بعد پیش آیا، یا بقول شبلی ۳ھ شوال میں کعب بنی نضیر کا سردار تھا، بنی نضیر سے آپ کی اس وقت کوئی مخالفت نہ تھی، نضیر کی عہد شکنی کا واقعہ جنگِ احد کے بعد کا ہے، جب کہ بنی نضیر نے دو

---

(۱) زرقانی ۲/۸، ۱۲ منہ (۲) فتح ۶/۳۵۸، ۱۲ منہ

مسلمانوں کو دھوکہ سے قتل کر دیا تھا، اور جب آنحضرت ﷺ ان کے پاس خون بہا لینے کے لیے گئے، تو انھوں نے آپ کے قتل کی سازش کی، اس کے بعد وہ لوگ جلاوطن کر دیے گئے، اگر کعب کا واقعہ بدر کے بعد کا ہے، تو بنی نضیر نے فوراً عہد شکنی کیوں نہیں کر لی"

مجھے حیرت ہے کہ جس شخص کے معلومات کا یہ حال ہو وہ کسی علمی مسئلہ پر قلم اٹھانے کی کس طرح جرأت کرتا ہے، شبلی نے کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ کعب شوال ۲ھ میں قتل ہوا، بلکہ انھوں نے ربیع الاول ۳ھ لکھا ہے، کعب بنی نضیر کا سردار کیا معنی، وہ اس قبیلہ ہی سے نہ تھا، یہ بھی غلط ہے کہ بنی نضیر سے آپ کی اس وقت کوئی مخالفت نہ تھی، اس لیے کہ ابوداود (۱۲۲/۲) اور زرقانی (۸۱/۲) اور فتح الباری (۲۳۲/۷) میں بسند صحیح مذکور ہے کہ قریش نے بدر کے بعد بنی نضیر کو آنحضرت ﷺ کی مخالفت پر ابھارا، اور بنونضیر نے بدعہدی اور پیمان شکنی کا عزم مصمم کر کے آنحضرت ﷺ کے پاس ایک پیام بھی بھیجا، جس کا منشا دھوکے سے آپ کو قتل کر دینا تھا، اس سازش کا ذکر سیرۃ النبی (۳۷۰/۱) میں بھی ہے۔ یہ تین باتیں میں نے نمونہ کے طور پر لکھ دی ہیں، ورنہ "حق گو" صاحب نے ان ہی چند سطروں میں اور غلط بیانیاں بھی کی ہیں۔

کعب بن الاشرف کے قتل کا سبب اس کے بعد میں "حق گو" صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ کعب کے قتل کا واقعہ بنی نضیر کی دشمنی و عداوت کی بنا پر پیش نہیں آیا تھا، بلکہ خود اس کی ذاتی فتنہ پردازیاں اور بدمعاشیاں اس کا سبب تھیں، جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں، اور خود آپ کو بھی اس کے ناپاک، فتنہ پرداز اور فتنہ انگیز ہونے کا اقرار ہے، پس گردن زدنی ہونے کے اتنے اسباب کو ناکافی سمجھ کر بنونضیر کی مخالفت کا تلاش کرنا اور اس کے نہ ملنے پر اس واقعہ کا انکار کر دینا کیا سراسر حماقت نہیں ہے؟

پھر "حق گو" صاحب نے اتنا بھی نہ سمجھا کہ اگر کعب کے قتل کا سبب یہ ہوتا

کہ وہ بنو نضیر سے تھا، اور بنو نضیر نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی ہے، تو اس صورت میں حیی بن اخطب، کنانہ اور سلام رؤساء نضیر قتل کرائے جاتے، نہ کہ کعب جو کہ نضیری نہ تھا، بلکہ عربی النسل طائی تھا۔

بنو نضیر کی جلاوطنی کس سنہ میں ہوئی اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کو یہ بھی بتادوں کہ بنو نضیر کی عہد شکنی اور جلاوطنی کا زمانہ اگرچہ بعض لوگوں نے جنگِ احد کے بعد بتایا ہے، لیکن قوی اور زیادہ مستحکم قول یہ ہے کہ ان کی جلاوطنی کا قصہ غزوۂ بدر کے چھ مہینے بعد پیش آیا، زرقانی نے شرح مواہب (۲/۸۰) میں اسی کو قوی ثابت کیا ہے، اور حاکم کی مستدرک میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی تصریح ہے، اور بخاری میں بروایت زہری اسی کو پہلے ذکر کیا ہے، اور ابوداود والی روایت مذکورہ بالا سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، اور ابن مردویہ اور عبد بن حمید کی ایک روایتِ صحیحہ بھی اس کی مؤید ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ اولاً تو راجح اور قوی قول کی بنا پر بنو نضیر کی جلاوطنی اور عہد شکنی کا واقعہ غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد پیش آیا، اور اگر غزوۂ احد کے بعد بھی پیش آیا ہو، تو اس سے کعب کے واقعۂ قتل کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ اس کے قتل کا سبب بنو نضیر کی پیمان شکنی نہ تھی۔ ''حق گو'' صاحب نے اس کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی غلطیاں کی ہیں، جن سے ہم بخوفِ طوالت اغماض کرتے ہیں۔

خلفاء بنو امیہ و بنی عباس پر تبرا بازی اس کے بعد فرماتے ہیں:

> ''میرے نزدیک یہ اتہام آنحضرت پر محض اس لیے لگایا گیا ہے کہ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس بلکہ ان کے بعد رؤساء والیان ملک کو اپنے اپنے مخالف کو دھوکے سے قتل کرادینے کے لیے سنت رسول کی ایک سند ہاتھ آجائے''

ہم کو ''حق گو'' صاحب کی اس بدحواسی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کبھی تو وہ

یہ لکھتے ہیں کہ حدیث کی اشاعت عباسیوں کی خلافت میں ہوئی (دیکھو صفحہ ۴) اور یہاں یہ ظاہر کیا کہ خلفاء بنی امیہ ہی کے زمانہ میں حدیث شائع ہو چکی تھی، اور اس کے ساتھ ہم کو ان کی مسلم دشمنی و قوم کشی اور مغرب زدگی و یورپ پرستی پر بھی بے حد حیرت ہے، نہیں معلوم ''حق گو'' صاحب کس قسم کے مسلمان ہیں کہ خلفاء بنی امیہ و بنی عباس کو بلا استثنا نفس پرور، خواہش پرست اور خونخوار و دغاباز قرار دیتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی، نہ علماء محدثین کو ''نفس پروردن'' اور ''خونخواروں'' کا معین و مددگار کہتے ہوئے ذرا حیا دامن گیر ہوتی، ''حق گو'' صاحب نے اس حدیث کے وضع کی ایک علت پیدا تو کی، لیکن میرا دعویٰ ہے کہ وہ اور ان کے اعوان و انصار کسی خلیفہ یا والی ملک کا کوئی ایسا واقعہ نہیں دکھا سکتے کہ اس نے کسی دشمن کو دھوکے سے قتل کرا کے اس حدیث سے حجت پکڑی ہو۔

اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر ان کے خیال میں اس حدیث کو وضع کرنے سے یہ مقصود تھا، تو ذیل کی حدیثیں کیوں ''وضع'' کی گئیں:

۱- جو شخص کسی معاہد کو بے وجہ قتل کر دے، تو اس پر جنت حرام ہے، اس کو جنت کی ہوا بھی نہ لگے گی (بخاری، ابوداود، نسائی)

۲- ہر عہد شکن کے لیے قیامت میں اس کی بد عہدی کا ایک جھنڈا گاڑا جائے گا، جس سے اس کی پیمان شکنی کو رسوا کیا جائے گا (بخاری وغیرہ)

۳- فتح مکہ کے دن ابوسفیان اور ان کی بی بی ہندہ کو جس نے عم رسول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا، معافی دینا اور نیز یہ اعلان کر دینا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کے لیے بھی امن کی ذمہ داری ہے (فتح الباری جلد ۸)

اس قسم کی صدہا احادیث اور واقعات جو کتب احادیث میں مذکور ہیں، آخر وہ کس لیے ''وضع'' کیے گئے، ''حق گو'' صاحب ہوش کی بات کیجیے، عقل سے اتنی بیگانگی اچھی نہیں۔

''حق گو'' صاحب نے چھٹا عنوان یوں قائم کیا ہے:

آنحضرت کا عکل وعرینہ کی قوم سے نہایت عذاب وبیدردی سے انتقام لینا

اوائل صدی کے مسلمانوں پر حملہ اس عنوان کے ماتحت اپنی مسلم دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے مسلمان قوم اور وہ بھی اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں کی شان میں یوں قصیدہ خوانی کی ہے:

> ''اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں میں بکثرت جنگ وفتوحات و خونریزی سے یہ ذہنیت پیدا ہوگئی تھی کہ کسی شخص کے شرف وبزرگی کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ حد درجہ جنگجو، سنگدل اور شہوت راں ہو، اسی ذہنیت میں ہماری حدیثیں وضع کی گئی ہیں اور راویوں کو آنحضرت کو اس رنگ میں دکھلانے میں خاص مزہ آتا ہے''

مجھے سخت حیرت ہے کہ ایک مدعی اسلام جس کو متبع قرآن اور حقیقی مسلم ہونے کے دعویٰ کے ساتھ تاریخ کی پوری واقفیت کا بھی دعویٰ ہے، اس کے قلم سے مذکورہ بالا الفاظ کس طرح نکلے، حالانکہ اسلام کا ایک دشمن بھی اگر وہ شریف ہو، تو ان کے لکھنے سے اس لیے پرہیز کرے گا کہ اس میں اس کے علم وواقفیت، اس کے انصاف ودیانت اور اس کی صداقت وراستی کی سخت توہین ہے، اوائل صدی ہجری کے مسلمانوں سے اگر صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں، تو ''حق گو'' صاحب کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے، اس لیے کہ ان کے اس رافضیانہ حملہ کی زد حدیث پر نہیں، بلکہ براہِ راست قرآن کریم پر

پڑتی ہے، صحابہؓ کی جو مدح سرائی قرآن کریم میں کی گئی ہے، اس سے کوئی واقفِ قرآن بے خبر نہیں ہے؛ اور اگر تابعین واتباع تابعین مراد ہیں، تو یہ ان کی جہالت اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، تاریخیں شاہد ہیں کہ ان کا دامنِ اخلاق ان گندگیوں سے پاک تھا، بعض بعض افراد اگر ان بداخلاقیوں کے مرتکب ہوں تو ان کی وجہ سے پوری جماعت کو متہم کرنا صریح ظلم ہے، اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ میں ساری قوم کو متہم نہیں کرتا، بلکہ ان میں بعض ہی افراد کی ذہنیت خراب ہوئی، اور انھیں نے حدیثیں وضع کیں؛ تو میں کہوں گا کہ یہ بات نہایت بعید از قیاس ہے کہ چند سنگدل اور شہوت راں اشخاص ایک بات رسول پاک ﷺ پر افترا کریں اور اہلِ علم وصلاح کی جماعت اس کو قبول و تسلیم کر لے، حالانکہ اس جماعت کا اصول یہ ہے کہ جس کی پابندیٔ شریعت یا راستبازی میں ادنیٰ اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کی روایتوں کو قبول نہیں کرتی، کتب جرح وتعدیل میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔

کیا یہ قرآن کا انکار نہیں ہے؟ پھر غور تو کیجئے کہ قرآن میں امت محمدیہ کو خیر الامم کا لقب عطا کیا گیا، اس کا امتیازی وصف نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا بتایا گیا ہے؛ لیکن اگر اوائل صدی ہجری ہی کے مسلمان جنگجو، سنگدل اور شہوت راں تھے، اور ان اوصاف رذیلہ کو محبوب بنانے کے لیے رسول پاک ﷺ کو بھی ان اوصاف سے متہم کرتے تھے، تو مجھے ''حق گو'' صاحب بتائیں کہ اس قوم کو خیر الامم کا لقب دینا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟ اور وہ نیکی کی بات بتانے والی اور برائی سے روکنے والی کیسے ہوسکتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ''حق گو'' صاحب ظاہر میں اگرچہ صرف حدیثوں کے منکر ہیں، مگر در پردہ قرآن کے بھی سخت مخالف ہیں۔

دشمنانِ اسلام کی بدگوئیوں کی صدائے بازگشت اس کے بعد مسلمانوں کے آقا ومولیٰ ﷺ کی شانِ عالی میں دشمنانِ اسلام نے جو گستاخیاں کی ہیں، ''حق گو''

صاحب ان کا اعادہ کرتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک جملہ علماء اسلام تو افترا پرداز، شہوت پرست اور عظمت وحرمتِ رسول اللہ ﷺ کے احساس سے بے بہرہ تھے، لیکن ان کے یورپین مقتدا اور پیشوا بالکل سچے اور معصوم ہیں، فرماتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ اگر حدیث کی روایتوں کو صحیح مان لیا جائے، تو آنحضرت باوصف اس کے کہ سن رسیدہ تھے، اور اپنی ساری جوانی کو ایک بوڑھی بیوہ کے ساتھ گزار چکے تھے

۱- ایک رات میں اپنی تمام بیویوں کے پاس ہو آتے تھے۔

۲- ہمیشہ خوبصورت عورتوں کو نکاح میں لانے کے خواہشمند رہتے تھے۔

۳- جو بیوی جوانی سے ڈھل چکی ہوتیں، ان کو آپ طلاق دینے پر تیار ہو جاتے۔

۴- کسی اجنبی عورت کا حسن دیکھ کر بے قرار ہو جاتے اور گھر پر آ کر اپنی بیوی سے جو سامنے آ جاتی، اگرچہ وہ کام کاج میں مشغول ہوتی، حاجت براری کر لیتے۔

۵- خلافِ وقت اپنی بیوی کے پاس چلے جاتے، اور اس پر بیویوں میں خوب جھگڑا ہوتا۔''

ہمارے ناظرین اس اقتباس کو اپنی طبیعت پر جبر کر کے پڑھیں، اور انصاف سے کہیں کہ کیا ''حق گو'' صاحب نے بد باطن عیسائیوں اور کمینہ فطرت آریوں کی ہو بہو نقل نہیں اتاری ہے؟ ہاں اگر فرق ہے تو یہ کہ عیسائی اور آریہ ایک حد تک معذور ہیں، اس لیے کہ ان کو اسلامی لٹریچر سے واقفیت بہت کم اور ان کے مذہبی معلومات نہایت محدود اور صحیح و غلط کی تمیز یکسر مفقود ہے۔ دوسرے وہ اپنی تیرہ درونی اور اس

بغض و عداوت کی وجہ سے بھی جو ان کو اسلام اور داعی اسلام علیہ السلام سے ہے، جھوٹ بولنے اور بے سروپا الزام تراشنے اور آنحضرت ﷺ کی شان میں دریدہ دہنی کرنے پر مجبور ہیں، اور ''حق گو'' صاحب اسلام کے مدعی، اسلامی معلومات کا خزانہ اور اسلام و داعی اسلام علیہ السلام کے ''جاں نثار'' ہیں، اس لیے وہ کسی طرح معذور نہیں ہیں، افسوس:۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ حق گو دارد وائے گر در پس امروز بود فردائے

''حق گو'' اپنی اصلی شکل میں ''حق گو'' صاحب اپنی زبان سے چاہے جو کچھ کہیں، مگر اقتباسِ مذکورہ بالا ان کے دلی جذبات کی صاف پردہ دری کر رہا ہے، اور ہر چند کہ انھوں نے ہوشیاری سے اپنا گناہ حدیثوں اور ان کے راویوں کے سر تھوپ دیا ہے، لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ جو الزامات انھوں نے قائم کیے ہیں، ان میں سے اکثر کا کوئی نشان حدیث میں نہیں ہے، تو صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقت میں تو ان کو اپنے عیسائی اور آریہ دوستوں کی ہمنوائی اور ان کی رضا جوئی مقصود تھی، لیکن ان باتوں کو اپنے نام سے لکھنے کی جرأت نہیں ہوئی، تو جھوٹ موٹ حدیثوں کے نام سے ان کو لکھ دیا۔

''حق گو'' کو چیلنج اگر ''حق گو'' صاحب کو ہماری بات سے انکار ہو تو ہم ان کو چیلنج دیتے ہیں کہ انھوں نے الزامات نمبر ۲ و ۳ و ۴ و ۵ کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا حوالہ دیا ہے، لہٰذا وہ کتب احادیث سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ان روایات کو نقل کر کے ان کے لفظی ترجمہ کے ساتھ بلا کسی تحریف کے شائع کر دیں۔

گستاخانہ اعتراضات کا دندان شکن جواب میں تسلیم کرتا ہوں کہ حضرت جویریہ اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہما سے آپ نے نکاح کیا، اور یہ بیبیاں بے شبہہ خوبصورت بھی تھیں، لیکن روایات میں یہ تو کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ آپؐ نے (معاذ اللہ) ان کے حسن پر فریفتہ ہو کر نکاح کیا، بلکہ اس کے برخلاف روایات میں

بصراحت مذکور ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ سے خود ہی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہنے کی خواہش ظاہر کی (دیکھو اصابہ حالات جویریہ اور سیرۃ النبی شبلی) اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ یہ ہے کہ وہ رئیس بنی نضیر حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، جب وہ گرفتار ہو کر آئیں تو آنحضرت ﷺ کو خیال ہوا کہ یہ اگر کسی کی باندی اور کنیز بنادی گئیں، تو اس کو اپنی سخت بے عزتی سمجھیں گی، اس لیے ان کو نکاح کا پیغام دیا، انھوں نے منظور کرلیا۔

اس سلسلہ میں آپ نے عمرہ بنت جون کا نام بھی لیا ہے، حالانکہ ان کے قصہ میں بصراحت مذکور ہے کہ ان کے باپ نے خود بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ میری لڑکی سے نکاح کر لیجیے، اور یہ بھی ظاہر کیا کہ لڑکی بھی یہ شرف حاصل کرنے کی آرزو مند ہے (دیکھو فتح الباری ۲۸۷/۵) اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ ''حق گو'' صاحب کے الزام نمبر۲ کی کوئی بنیاد حدیثوں میں نہیں ہے، بلکہ اس کو انھوں نے محض اپنی جہالت کی بنا پر یا اپنے غیر مسلم دوستوں کی تقلید وحمایت میں لکھ دیا ہے۔

یہی حال الزام نمبر۳ کا بھی ہے، حدیثوں میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا جب بوڑھی ہوئیں، تو انھوں نے خود آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپ میرے لیے باری مقرر نہ کیجیے، میں اپنی باری حضرت عائشہؓ کو ہبہ کرتی ہوں۔ حضور ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی (دیکھو مسلم ۴۷۳/۱، و بخاری ۷۸۵/۲) صحیح روایتوں میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے، پھر یہ قصہ بھی تنہا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیش آیا، پس معلوم نہیں کہ ''حق گو'' صاحب کو کیا عناد ہے کہ انھوں نے ایک بے بنیاد الزام تراش لیا، اور اس کو ایسے الفاظ میں لکھا کہ جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ اکثر ہوتا رہتا تھا (توبہ توبہ)۔

اور یہی کیفیت الزام نمبر۴ کی بھی ہے، کتب حدیث میں حضرت عائشہ رضی

اللہ عنہا سے اس مضمون کی کوئی روایت ہی نہیں ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے البتہ ایک روایت ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے، کہ جب تم کسی عورت کو دیکھو اور تمھارے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو جائے، تو اپنی بی بی کے پاس چلے جایا کرو، اس وسوسہ کا علاج ہو جائے گا، لیکن اس روایت میں کسی عورت کے حسن کو دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا بے قرار ہو جانا (معاذ اللہ) مذکور نہیں ہے، اگر ''حق گو'' صاحب نے کسی عناد کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کی مقدس شان میں یہ گستاخی نہیں کی ہے، تو کیا وہ کسی روایت میں مذکورۂ بالا بیہودہ الفاظ دکھا سکتے ہیں۔

اور یہی نوعیت پانچویں الزام کی ہے، ''حق گو'' صاحب نے اس الزام میں حضرت زینب اور حفصہ و ماریہ رضی اللہ عنہن کے واقعات کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ حدیثوں سے یہ واقعات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا سرے سے کوئی ایسا واقعہ مذکور ہی نہیں ہے، اور حفصہ اور ماریہ رضی عنہما کا جو قصہ دشمنانِ اسلام آنحضرت ﷺ کی اہانتِ شان کے لیے ذکر کیا کرتے ہیں، اس کا بھی صحیح روایات میں کوئی نشان موجود نہیں، چنانچہ صحاح ستہ جو حدیث کے صحیح و مستند ترین مجموعے ہیں، ان میں حضرت حفصہؓ کی باری میں حضرت ماریہؓ کے پاس جانے کا کسی جگہ اشارہ تک نہیں ہے، اور طبری وغیرہ کی بعض روایات میں جو قصہ مذکور ہے، اس کی نسبت عینی شرح بخاری (۵۴۸/۹) نووی شرح مسلم (۴۷۹/۱) میں مصرح ہے کہ: ''ماریہؓ قبطیہ کا یہ قصہ کسی صحیح طریقہ سے وارد نہیں ہوا''، اور یہی بات قاضی عیاض نے بھی شرح مسلم میں کہی ہے (دیکھو نووی ۴۷۹/۱)، اور زمانۂ حال کے نامور مورخ شبلی نعمانی کی بھی یہی تحقیق ہے، پس ایسی نا قابلِ اعتبار روایات کو دکھا کر جن کو حدیثوں کے جاننے والے خود کمزور اور بے اصل بتا رہے ہیں، سارے ذخیرۂ احادیث کی نسبت بدگمانی پھیلانا کہاں کی دیانت ہے۔

اس مختصر بیان سے آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ ''حق گو'' صاحب کے چار الزامات تو بالکل بے بنیاد اور محض اتہام ہیں، اب رہی ان کی پہلی بات تو وہ بلاشبہ حدیث سے ثابت ہے، لیکن اس کو شہوت رانی کہنا انتہائی نادانی اور پرلے درجہ کی بے انصافی ہے، افسوس ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے الفاظ تو ضرور رٹ لیے ہیں، لیکن ان کے معانی سے قطعاً بے خبر ہیں! حیرت ہے کہ ان کو آج تک یہ خبر ہی نہیں کہ جائز محل میں جائز طریق پر طبعی خواہش کا پورا کرنا شہوت پرستی نہیں کہلاتا ہے، ورنہ پھر ''حق گو'' صاحب کے قول پر تو کوئی انسان شہوت پرستی سے خالی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم نے بی بی اور کنیز سے حاجت برآری کی صریح اجازت دے کر یہ فرمایا ہے کہ بیبیوں اور کنیزوں کے ساتھ خواہش پوری کرنے میں کوئی ملامت والزام نہیں ہے، لیکن ''حق گو'' صاحب کے نزدیک اس صورت میں بھی الزام ہے، کہیے ''حق گو'' صاحب کیا آپ حدیثوں کا انکار کر کے قرآن میں بھی اصلاح دینے لگے؟ کیا قرآن کریم کی ان آیتوں کے اطلاق وعموم سے یہ مستفاد نہیں ہوتا، کہ اگر متعدد بیبیاں ہوں، اور ان سب کے پاس ایک ہی دن میں ہو آئے تو بھی ملامت نہیں ہے؟

پھر ''حق گو'' صاحب نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ قرآن نے ہر مومن کے لیے چار چار عورتوں سے نکاح کرنے کی صراحۃً اجازت دی ہے، اور ہر عورت کے لیے علاحدہ علاحدہ باری مقرر کرنے کا کوئی حکم بیان نہیں کیا ہے، پس اگر کوئی شخص چار عورتوں سے نکاح کر کے سب کے پاس ایک ہی شب میں چلا جائے، تو وہ قرآنی حکم کی رو سے شہوت پرست کہلائے گا یا نہیں؟ اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ وہ شہوت پرست ہے، تو مہربانی کر کے وہ مجھے بتائیں کہ یہ حکم قرآن کی کس آیت میں مذکور ہے؟ اور جب کہ قرآن نے باری کا مسئلہ بیان نہیں کیا، تو شخص مذکور شہوت پرست کیوں کہا جائے گا؟ اور اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ وہ شہوت پرست نہیں ہے، تو وہ بتائیں کہ الزام نمبرا

میں جس حدیث کا حوالہ انھوں نے دیا ہے، اس کو پھر کیوں مطعون کرتے ہیں؟۔

اسی طرح تاریخوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے نو بیبیاں تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو سورۂ احزاب میں یہ اجازت دی ہے کہ:

''اپنی ان بیبیوں میں سے جن کو چاہئے اپنے نزدیک کیجئے، اور جن کو چاہئے دور رکھئے''۔

پس اگر آنحضرت ﷺ نے اپنی جملہ ازواجِ مطہرات کو کسی مصلحت سے ایک ہی رات میں اپنے نزدیک کرلیا، تو ''حق گو'' صاحب بتائیں کہ اس آیتِ قرآنی سے اس فعل کا جواز ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر کہئے کہ نہیں، تو میں کہوں گا کہ کیوں؟ کیا قرآن نے کسی آیت میں آنحضرت ﷺ یا عامہ مومنین کے لیے باری مقرر کرنا ضروری قرار دیا ہے، اور ایک دن یا رات میں سب بیبیوں سے صحبت کرنے کو ناجائز یا ''شہوت پرستی'' کا مرادف بتایا ہے؟ یا قرآن نے اسی مذکورہ بالا آیت میں آنحضرت ﷺ کو یہ حکم دیا ہے کہ اپنی ازواج کو باری باری سے علحدہ علحدہ راتوں میں اپنے نزدیک کیجئے؟ سو اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت نہیں ہے، تو یقیناً آیتِ بالا سے فعل مذکور کا جواز ثابت ہوگا، اور اگر کہئے کہ ہاں! فعل مذکور کا جواز آیت سے نکلتا ہے، تو پھر آپ نے حدیث ہی کو نشانۂ طعن کیوں بنایا؟ اپنے پیشرو غیر مسلموں کی طرح آیت ہی کی نسبت زہر افشانی کیوں نہیں کی؟۔

نوٹ واضح ہو کہ یہ تقریریں تمام تر الزامی ہیں، اور اگر قائلینِ حدیث کو مسئلہ قسم کی وجہ سے اشکال پیش آئے، تو اس کا حل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر باری مقرر کرنا واجب نہ تھا، اور اگر واجب بھی ہو تو ایک دورہ کے ختم ہونے اور دوسرے کے شروع ہونے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، یا جس کی باری اس دن تھی، اس کی اجازت سے ایسا ہوا تھا (نووی، فتح الباری)۔

اس عنوان کے ماتحت ''حق گو'' صاحب کی دوسری زہر افشانی اس کے بعد ''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

''اسی طرح آپ کے مغازی میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جس کا الزام حدیثوں نے اور اس سے زیادہ واقدی نے آپ پر نہ لگایا ہو، یعنی بوڑھے ناتوانوں کو قتل کرانا، بچوں والی ماں کو قتل کرانا، جنگِ خیبر میں لوگوں کو آگ سے عذاب دینا کہ خزانہ کا پتہ بتائیں، کھیتوں اور مکانوں کو برباد کرنا، لوگوں کو تہِ تیغ بے دریغ کرانا، ان کی عورتوں کو بلا نکاح لوگوں کے حوالہ کر دینا''۔

''حق گو'' صاحب کی جرأت قابلِ داد ہے، کہ حدیثوں کو مطعون کرنے کے لیے اتنی ساری باتیں لکھ ڈالیں، لیکن حوالہ ایک کا بھی نہ دیا، حالانکہ آپ کو چاہیے تھا کہ جس طرح یہ بے سروپا باتیں آپ نے دل سے گھڑ لی ہیں، ان کے لیے حوالے بھی تراش لیتے، ''حق گو'' صاحب اس افترا پردازی اور بہتان طرازی سے آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، جب کہ خود صحاح میں ذیل کی حدیثیں آپ کی تکذیب کے لیے موجود ہیں۔

''حق گو'' کے افتراؤں کا جواب بروئے احادیث ۱- ابوداود (۲/۲۵۹) میں بروایت انس رضی اللہ عنہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: و لا تقتلوا شیخاً فانیاً، و لا طفلاً، و لا صغیراً، و لا امرأۃً (یعنی) کسی ناتواں بوڑھے کو قتل نہ کرنا، نہ کسی بچے کو، نہ کسی کم عمر والے نابالغ لڑکے کو، نہ کسی عورت کو۔ اور بخاری (۲/۴۲۳) میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا، اور ابوداود و دیگر کتبِ صحاح میں ہے: کہ کسی لڑائی میں آنحضرت ﷺ نے کسی عورت کو مقتول پایا، تو بڑی ناگواری ظاہر فرمائی۔

ان حدیثوں سے "حق گو" صاحب کی پہلی اور دوسری بات کا بے سر و پا اور افترا ہونا آفتاب کی روشن ہے۔

۲- حدیثوں میں کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ خیبر میں خزانہ چھپانے والوں کو آگ سے عذاب دیا، بلکہ اس کے برخلاف ابوداود میں مذکور ہے کہ حیی بن اخطب کے بھائی سعیہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خزانہ کی نسبت دریافت کیا، اور اس نے چھپایا، لیکن اس کا کچھ ذکر نہیں ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کوئی معمولی ہی سزا دی، اور بعض لوگ جو یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کنانہ یہودی اسی جرم میں مارا گیا، تو یہ بالکل غلط ہے، کنانہ محمد بن مسلمہ ؓ کے قصاص میں مارا گیا ہے، جیسا کہ تاریخ طبری میں مصرح ہے، اور یوں بھی یہ بات لغو معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اگر کنانہ کا یہی جرم تھا، کہ اس نے خزانہ چھپایا تھا، تو یہ جرم سعیہ نے بھی کیا تھا، جیسا کہ ابوداود میں مصرح ہے، لیکن اس کی سزایابی یا قتل کا ذکر کوئی نہیں کرتا، بہر حال حدیثوں میں اس الزام کا کوئی نشان نہیں ہے۔

۳- کھیتوں کے برباد کرنے کا کوئی واقعہ حدیثوں میں مذکور نہیں ہے، ہاں غزوۂ بنی نضیر میں لینہ (ایک قسم کی کھجور) کے کچھ درخت کٹوانے اور ان کے جلوانے کا ذکر ضرور ہے، لیکن یہ تنہا حدیثوں میں نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں بھی مذکور ہے، اور خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے بجائے اظہارِ ناراضی کے اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا ہے، کہ یہ سب ہماری اجازت وخوشی سے ہوا ہے، سورۂ حشر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفَاسِقِيْنَ﴾ (یعنی) تم نے لینہ جو درخت کاٹے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو یہ سب اللہ کے حکم سے تھا، اور تاکہ خدا فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے"۔

حضور کا عفو عام اور کرم بے پایاں | ۴- لوگوں کو تہِ تیغ بیدریغ کرانا بھی

حدیثوں سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ وہ آپ کے عفو عام اور کرم بے پایاں کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ غزوۂ بدر، غزوۂ بنی مصطلق، فتح مکہ اور ہوازن کے اسیروں کے حالات مشتے نمونہ ازخروارے کے طور پر کتب احادیث میں پڑھئے اور سیری تصدیق کیجئے۔

توریت کی شہادت اور اگر کسی شخص کو یہود بنو قریظہ کے واقعات سے دل میں خلجان پیدا ہو، تو وہ توریت کی کتاب ''استثنا'' کی آیتیں پڑھے:

''اور جب تو کسی شہر کے پاس ان سے لڑنے کے لیے آپہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا، کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور، اور دروازہ تیرے لیے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے، تیری خراج گزار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے، بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کرنا، اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کر دے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لیے لے'' (ب۲۰)۔

اس سے اس کو یقین ہو جائے گا کہ یہودِ بنی قریظہ کو جو سزا دی گئی، وہ بعینہٖ اس کی شریعت کے مطابق تھی، چنانچہ اسی وجہ سے سردارِ بنی قریظہ نے اپنے قتل سے پہلے یہ کہا کہ:

''یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہی حکم الٰہی تھا اور ایسا ہی لکھا ہوا تھا'' (دیکھو طبری)

۵- کافروں کی عورتوں کو کنیز بنانے کا الزام بھی نہایت بیہودہ الزام ہے، تاریخ شاہد ہے کہ یہ دستور نہایت قدیم ہے، اور اگلی شریعتوں نے بھی اس کو جائز رکھا ہے، چنانچہ توریت کی کتاب ''استثنا'' کے باب ۲۱ میں اس کی اجازت بصراحت مذکور

ہے، لہٰذا تنہا مذہب اسلام کو نشانۂ ملامت بنانا (جیسا کہ غیر مسلموں نے کہا ہے) سخت بے انصافی اور بد دیانتی ہے، اور اس سے زیادہ بے انصافی حدیثوں کو مطعون کرنا ہے (جیسا کہ ''حق گو'' نے کہا ہے) اس لیے کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں: ﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ کے عنوان سے حدیثوں سے نفع اٹھانے کو جائز و مباح قرار دیا ہے، اور سورۂ احزاب میں اس کے ساتھ ﴿مِمَّا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ﴾ کے الفاظ بھی ہیں، جو خاص ان چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، جو جنگ میں غنیمت کے طور پر حاصل ہوتی ہیں۔

عرنیین کا واقعہ اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے عرنیین کا واقعہ صحیحین سے نقل کر کے لکھا ہے:

''۱- ڈاکٹر زویمر ایک متعصب امریکن مشنری نے اس روایت کو ہو بہو فوٹو سے چھاپا ہے۔

۲- ایک ایسا شخص جو جانور کے وحشیانہ ذبح اور تیر باراں کرنے پر سختی سے منع کرتا ہے، اور اس وقت جب کہ آپ کے چچا حمزہ کا میدان احد میں مثلہ کیا گیا، بدلہ نہیں لیتا، وہ ایک انسان کو ایسی بے دردی سے قتل کرائے ناممکن ہے۔

۳- اس روایت کے متن اور اسناد میں اختلاف و تناقض ہے۔

۴- یہ روایت صرف حضرت انس سے مروی ہے، دوسرے کسی صحابی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

۵- اس روایت میں پیشاب پینے کا حکم دینا بھی مذکور ہے، تو کیا حضور ناپاک اور حرام چیز کے استعمال کا بھی حکم دیتے تھے''۔

امر اول کا جواب ''حق گو'' صاحب یورپ اور امریکہ سے ایسے مرعوب ہیں، کہ

جس بات کو کسی یورپین یا امریکن نے معیوب کہہ دیا، وہ اس کو معیوب اور قابل نفرت سمجھنے لگتے ہیں، لیکن یہ مرعوبیت یا تقلید جامد انہیں کو مبارک ہو، مسلمانوں کے نزدیک حسن و قبح کا واحد معیار خدائے تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحسان و استہجان ہے، زویمر نے اگر اس روایت کو فوٹو سے چھاپا، تو یہ اس کی بے عقلی و بد دیانتی ہے، اور اس کو ''متعصب امریکن مشنری'' جانتے ہوئے آپ کا اس کی اس حرکت سے متاثر ہونا اور اس حدیث کا انکار کر دینا بھی سخت نافہمی ہے، آپ کو عقل سے کام لینا چاہئے تھا، کہ متعصب عیسائی قرآن کریم، رسالتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام میں سے کس چیز پر حرف گیری نہیں کرتے اور ان میں سے کس کا مضحکہ نہیں اڑاتے، تو کیا آپ ان چیزوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے؟

عیسائی اپنے گھر کی خبر لیں آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ زویمر کو اس روایت پر حرف گیری کا کیا حق حاصل تھا، جب کہ عہد نامۂ قدیم کی متعدد کتابوں میں مرتد کے قتل کا صریح حکم موجود ہے (دیکھو کتاب استثنا ب ۱۷، اور ب ۱۳، اور کتاب احبار ب ۲۴) اور کتاب خروج ب ۳۲ میں بنی اسرائیل کے ارتداد اور گوسالہ پرستی کے قصہ میں مذکور ہے:

''تب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے، اور اس نے انھیں کہا، کہ خداوند! اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گذرتے پھرو، اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک اپنے دوست اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے، اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق کیا، چنانچہ اس دن لوگوں میں قریب تین ہزار مرد مارے پڑے، اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے تئیں مخصوص کرو، ہر ایک مرد

اپنے بیٹے اور اپنے بھائی پر حملہ کرے، تا کہ وہ آج تمھیں برکت دے''۔

زو بیر کو انصاف کی ہوا لگی ہوتی، تو سات آٹھ مرتدین کی بجائے ان تین ہزار آدمیوں کے ''نہایت بیدردی'' سے صرف ایک دن میں قتل کیے جانے کا فوٹو کھینچ کر بتاتا کہ یہ اس عہد قدیم کی تعلیم ہے، جس کو جاری کرنے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں آئے تھے، آخر یہ کیا کہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے، لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا؟

امر ثانی پر گفتگو ''حق گو'' صاحب! ہوش میں آیئے، حدیثوں کا انکار کرنے کے بعد آپ کے لیے ممکن نہیں، کہ آنحضرت ﷺ کا جانوروں کے وحشیانہ ذبح اور تیر باراں کرنے سے منع کرنا، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مُثلہ کا بدلہ نہ لینا بیان کر سکیں، یہ سب باتیں تو حدیث ہی کی بدولت معلوم ہوسکتی ہیں، اور اس کے آپ منکر ہیں، لہذا یا تو انکارِ حدیث سے توبہ کیجئے، یا ان باتوں کا ذکر چھوڑ یئے، کہیے! اب تو آپ کے لیے حدیث حلق کی ہڈی ثابت ہوئی ہوگی، کہ اُگلتے بنے نہ نگلتے بنے؛ بہر حال خوب سوچ کر جواب دیجئے، اور اس کے بعد اپنی دوسری بدحواسی ملاحظہ کیجئے کہ آپ عرنیین کے قتل کو ''بیدردانہ انتقام'' سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ آپ نے خود ہی عرنیین کے واقعہ میں نقل کیا ہے کہ:

''ا- وہ مرتد ہو گئے، (یعنی مسلمان ہونے کے بعد دین سے پھر گئے) اور ۲- آنحضرتؐ کے چرواہے کو مار ڈالا، ۳- اور اونٹوں کو بھی ہانک لے گئے''۔

یعنی انھوں نے تین بڑے بڑے جرم کیے تھے، ارتداد اور قتل ناحق اور ڈاکہ زنی، ان میں سے تنہا ارتداد اتنا بڑا جرم ہے، جس کا اور کوئی جرم مقابلہ نہیں کر سکتا، اور ہر شریعت میں اس کی سزا قتل قرار دی گئی ہے، تورات کی تصریحات پہلے آپ ملاحظہ کر

چکے ہیں۔

سزائے ارتداد اور قرآن توریت کے اسی واقعہ کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

وَ اِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَومِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوا اِلٰی بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ	(یعنی) اور یاد کر جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا، پس اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو، کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمارے خالق کے نزدیک اچھا ہے، وہ بہت توجہ کرنے والا مہربان خدا ہے"

دیکھئے قرآن نے بھی ارتداد کی سزا قتل ہی بتائی ہے، لیکن چونکہ آپ جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کفر و شرک کوئی جرم نہیں ہے، (حالانکہ اگر آپ حقیقۃً قرآن کے متبع ہوتے، تو شرک سے بڑھ کر آپ کے نزدیک کوئی جرم نہ ہوتا، کہ خدا فرماتا ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ یعنی شرک بے شبہہ بہت بڑا ظلم ہے) اس لیے اس جرم کو کوئی اہمیت بھی نہ دیجئے، تو باقی دو جرم ہی کیا کم ہیں، قتل ناحق کے بدلے قتل، اسی طرح راہزنی کی سزا میں راہزن کی گردن اڑا دینا، سولی دینا، اور الٹے ہاتھ پاؤں کاٹنا قرآن کا صریح حتمی حکم ہے، قتل ناحق کے باب میں ﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی﴾ وغیرہ کی تلاوت کیجئے۔

راہزنوں کی سزا اور راہزنوں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا جَزٰؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْا اَوْ یُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا﴾

کیا قرآن کے اس حکم کے بعد بھی عرنیین کے قتل کو بیدردانہ انتقام کہیں

گے؟ کیا قرآن نے ان مجرموں کے ساتھ ہمدردی کی تعلیم دی ہے؟ اچھا قرآن نہیں، دنیا میں کسی قانون ملکی نے ایسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی کو جائز رکھا ہے؟ کیا آپ نے کسی حکومت کی تاریخ میں پڑھا ہے، کہ اس نے خونیوں، حکومت کے باغیوں اور ڈاکوؤں کو جاگیریں، خلعتیں اور منصب دیے ہوں؟ اگر نہیں تو پھر یہ حدیث آپ کی آنکھوں میں کیوں کھٹک رہی ہے۔

عرنیین کی سفاکیاں اس کے بعد سنئے کہ عرنیین نے ایک ہی نہیں، بلکہ کئی چرواہوں کو قتل کیا تھا (مسلم ۲/۵۷، نسائی ۲/۱۶۷) اور صحیح ابن حبان میں ہے: ثُمَّ مالوا علی الرُّعاۃِ فقتلوھم' یعنی عرنیین چرواہوں کی طرف جھکے اور ان کو مار ڈالا''، اور انھوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں بھی پھیری تھیں، مسلم (۲/۵۸) ترمذی (ص ۳۶) نسائی (۲/۱۶۸) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: انما سَمَلَ النبیُّ ﷺ اعینَھُمْ لِانَّھُم سَمَلُوا اعْیُنَ الرُّعاۃ'' (یعنی) آنحضرت ﷺ نے عرنیوں کی آنکھوں میں سلائی اس لیے پھروائی کہ انھوں نے چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری تھیں' اور سیر کی کتابوں میں یہ تصریح بھی ہے کہ انھوں نے چرواہوں کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹے تھے (یعنی مثلہ کیا تھا)، پس جس نوعیت سے انھوں نے چرواہوں کو مارا تھا، بعینہ ایسی ہی سزا ان کو دی گئی، تاکہ پھر ان حرکات ناشائستہ کی جرأت کوئی نہ کرے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد کسی کو ایسی سزا آپ نے نہ دی۔

مثلہ کرنے سے حضور ﷺ کی ممانعت بلکہ اس کے بعد خطبہ میں آنحضرت ﷺ نے مثلہ کی برائیاں بیان کیں، اور سختی سے اس کو ممنوع قرار دیا، جیسا کہ خود حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے (دیکھو ابوداود و نسائی)۔

غیر موذی بے زبان جانوروں پر خونی اور ڈاکو عرنیوں کو قیاس کرنا بھی ''حق

گو" صاحب ہی کی عقل جائز رکھتی ہے، اسی طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مثلہ پر بھی عرنیوں کے ظلم وستم کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ اولاً تو مرتد اور اصلی کافر کے احکام جدا جدا ہیں: ثانیاً آنحضرت ﷺ اس ظلم وستم کا انتقام نہ لیتے تھے، جس کا تعلق براہِ راست آپ سے ہو، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی مظلومیت اسی قسم سے تھی، لیکن دوسرے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ہوتا تھا، اس کی واجبی سزا ظالموں کو ضرور دیتے تھے، اس لیے کہ اگر ایسا نہ کرتے مظلومین کی دادرسی نہ ہوتی، اور نہ ظالموں کی عبرتناک سزا دیکھ کر دوسرے لوگ ظلم سے باز رہتے۔ عرنیین کا ظلم اسی قبیل سے تھا، اس لیے ان کو سزا دینا ضروری اور واجب تھا، آدمی اپنے حقوق چھوڑ دے اور معاف کر دے، لیکن دوسروں کے حقوق کو معاف کرنے کا اس کو حق نہیں ہے۔

امر ثالث پر بحث "حق گو" صاحب نے اس روایت کے متن واسناد کے اختلاف کا جو ذکر کیا ہے، وہ ان کی ناواقفیت کی بین دلیل ہے، متن میں انھوں نے یہ اختلاف دکھایا ہے کہ کہیں ان کو پیاسا تڑپا کر مارنا مذکور ہے، اور کہیں آنکھوں میں کانٹے چبھونے کا ذکر ہے؛ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو اختلاف بیانی کہنا ناسمجھی ہے، بات یہ ہے کہ عرنیین کے ساتھ یہ دونوں معاملے ہوئے تھے، مگر راویوں نے جب قصہ کو مختصر کر کے بیان کیا، تو کسی نے یہ جزو حذف کر دیا، اور کسی نے وہ جزو حذف کر دیا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن روایتوں میں تفصیلی بیان ہے، ان میں دونوں باتیں مذکور ہیں (دیکھو نسائی ۲/۱۶۶، و ۲/۱۶۷) اور اسناد میں یہ اختلاف دکھایا ہے کہ:

"ایک جگہ ہے: محمد بن الصلت، حدثنا الولید حدثنا الاوزاعي عن یحییٰ عن ابي قلابة عن أنس، دوسری جگہ ہے: موسی بن اسمعیل عن وھب عن ایوب عن ابي قلابة"

لیکن یہ بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، قصہ یوں ہے کہ ابوقلابہ کے دو شاگرد

ہیں، ایک ایوب دوسرے یحییٰ، اور ان دونوں نے ابوقلابہ سے اس حدیث کو سنا ہے، پھر ایوب سے وہیب نے اور ان سے موسیٰ بن اسمٰعیل نے اس حدیث کو سنا ہے، اور یحییٰ سے اوزاعی نے، اور اوزاعی سے ولید نے، اور ولید سے محمد بن الصلت نے سنا، پھر بخاری موسیٰ اور محمد بن الصلت دونوں کے شاگرد ہیں، اور ان دونوں سے انھوں نے اس حدیث کو سنا ہے، اس لیے کہیں موسیٰ کے واسطہ سے ان کی بیان کی ہوئی روایت ذکر کرتے ہیں، اور کہیں محمد بن الصلت کے واسطہ سے اس روایت کو ذکر کرتے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ فن کی ایسی معمولی اور کثیر الوقوع بات بھی ''حق گو'' صاحب کو سمجھانی پڑتی ہے:۔

ذوق بازیگہ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں : ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

''حق گو'' صاحب آپ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ پروفیسر براؤن کی کوئی تحقیق آپ سے ان کے دو شاگرد نکلسن اور اسمتھ بیان کریں اور آپ اس تحقیق کو نقل کرنے کے وقت کبھی یوں کہیں کہ مجھ سے اس کو نکلسن نے بیان کیا، اور کبھی کہیں کہ مجھ سے اسمتھ نے بیان کیا، تو اس کو اختلاف بیانی نہ کہیں گے، بلکہ کہا جائے گا کہ دونوں بیان صحیح ہیں۔

امر رابع پر گرفت یہ ''حق گو'' صاحب کی لاعلمی اور انتہائی ناواقفیت ہے، اس واقعہ کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے (نسائی ۲/ ۱۶۷) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے (نسائی ۲/ ۱۶۷، ابوداود ۲/ ۱۴۰) اور حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ نے (زرقانی ۲/ ۱۷۶) بھی روایت کیا ہے۔

امر خامس پر نظر حدیث مذکور پر ''حق گو'' صاحب کا پانچواں اعتراض بھی قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے، پیشاب بیشک ناپاک ہے، اور اس کا استعمال بھی بے شبہہ حرام ہے، لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ عرنیین کو استسقاء کی بیماری ہو گئی تھی، اطبا کی قلت،

دواخانوں کے فقدان اور بے زری کی وجہ سے کوئی دوسرا علاج ممکن نہ تھا، اور عرب لوگ اس مرض کا علاج اونٹ کا پیشاب پلا کر کیا کرتے تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کی جان بچانے کے لیے اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت دی، جیسا کہ قرآن کریم نے مردار اور دمِ مسفوح وغیرہ کو حرام قطعی بتاتے ہوئے اس شخص کے لیے بقدر سدِّ رمق استعمال کرنے کی اجازت دی، جس کی بھوک پیاس سے جان جا رہی ہو ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ کیوں ''حق گو'' صاحب! کیا یہاں بھی آپ سوال کر بیٹھیں گے کہ کیا خدا مردار کھانے کی اجازت دیتا ہے؟ تو پھر اسی پر عرنیین کے واقعہ کو بھی قیاس کر لیجیے۔

"حق گو" صاحب نے ساتواں عنوان یوں قائم کیا ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۹ رسال کی عمر میں نکاح کرتے ہیں"

اور اس کے ماتحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح اور رخصتی کا واقعہ نقل کر کے لکھتے ہیں:

"نکاح کے لیے بلوغ کی شرط نہ صرف قرآن کے صاف صریح الفاظ حتی اذا بلغوا النکاح سے ثابت بلکہ کوئی متمدن قانون نہیں ہے، جو نکاح کے لیے بلوغ کو ضروری نہ کہتا ہو، نکاح سے میری مراد خلوت صحیحہ اور جماع ہے، اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا ہے جب تک عورت بالغ نہ ہو، کیونکہ ایجاب وقبول کے لیے شرط بلوغ ہے، عرب میں ہر زمانہ میں بلوغ کی عمر زیادہ رہی ہے"۔

"حق گو" صاحب کا یہ فرمانا تو ایک حد تک بجا ہے، کہ خلوت و جماع کے لیے بلوغ شرط ہے، لیکن اس سے بہتر عنوان یہ تھا کہ "اہلیت وصلاحیت شرط ہے"۔

جوازِ نکاح کے لیے بلوغ شرط نہیں باقی ان کا یہ دعویٰ کہ نکاح کے لیے بلوغ کی شرط قرآن کے الفاظ ﴿حتی اذا بلغوا النکاح﴾ سے ثابت ہے، بالکل غلط ہے؛ "حق گو" صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس آیت کے یہ الفاظ ہیں، اس میں نکاح اور اس کے شرائط کا بیان نہیں ہے، بلکہ مالِ یتیم کی نگرانی وحفاظت کا حکم اس میں مذکور ہے، اور اس کا حاصل یہ ہے کہ "جب یتیم بچے نکاح کو پہنچ جائیں اور تم کو محسوس ہو کہ اب وہ اپنے مال کی حفاظت کر لیں گے، تو ان کو ان کا مال دیدو"۔ قرآن کے

الفاظ یہ ہیں: ﴿حتی اذا بلغوا النکاح فان آنستم منھم رشدا فادفعوا الیھم اموالھم﴾ بتائیے کہ ان میں کس لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ نکاح کے لیے بلوغ شرط ہے اور اس کا یہاں کیا محل ہے؟ اگر کہیے کہ آیت میں اگرچہ نکاح کا حکم مذکور نہیں، تاہم اذا بلغوا النکاح سے یہ مستفاد ہوتا ہے، کہ انسان ابتدائے پیدائش سے ہی جماع کے قابل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے کوئی خاص وقت ہوتا ہے، اسی لیے فرمایا کہ ''جب یتیم بچے نکاح کو یعنی اس کے وقت کو پہنچ جائیں'' تو میں کہوں گا کہ بیشک یہ ضرور مستفاد ہوتا ہے، لیکن اس خاص وقت کا بیان قرآن میں نہیں ہے، یعنی اس وقت کی قرآن نے تعیین نہیں کی کہ وہ حیض کی ابتدا یا آغازِ احتلام کا وقت ہے، یا عمر انسانی کا کوئی معین سال، مثلاً پندرہواں یا اٹھارہواں سال، یا وہ وقت جب کہ مرد و عورت میں جماع کی قوت پیدا ہو جائے، چاہے حیض یا احتلام شروع ہو یا نہ ہو، اور عمر کے پندرہ یا اٹھارہ سال پورے ہوئے ہوں یا نہ ہوں، پس جب قرآن میں یہ تعیین [نہیں] (۱) ہے، تو آپ کا مدعا کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ آیت آپ کے مفید مطلب ہو سکتی ہے۔

یہ آیت ''حق گو'' کے مدعا کے خلاف ہے بلکہ اگر آپ غور کریں گے تو یہ آیت آپ کے مطلب کے لیے بہت مضر ثابت ہوگی، وہ اس طرح کہ اگر جماع کے لیے اللہ کے علم میں کوئی خاص سال عمر کا متعین ہوتا، اور اس سے کم عمر میں وطی حرام ہوتی، تو صاف صاف اس سال معین کا نام لینے میں کیا قباحت تھی؟ خصوصاً جب کہ قرآن کے سوا (بزعم منکر حدیث) اور کوئی ذریعۂ بیان بھی موجود نہ تھا، پس دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس وقت خاص کی تعیین اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے حوالہ کی

(۱) لفظ ''نہیں'' دوسرے اور تیسرے اڈیشن میں چھوٹ گیا ہے، پہلے اڈیشن میں موجود ہے، وہیں سے اس عبارت کی تصحیح کی گئی ہے۔ (مسعود احمد)

ہو گی، اور لوگوں کو مامور کیا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے اس خاص وقت کی تعیین معلوم کرو، یا پھر اس کو زوجین اور ان کے اولیاء کی رائے پر چھوڑا ہوگا کہ زوجین خود یا ان کے سرپرست عرف و عادت اور جسمانی حالات وغیرہ کے ذریعہ سمجھیں کہ ان میں جماع کی قوت وصلاحیت پیدا ہوگئی ہے یا نہیں؟ بہر حال کسی شق میں جماع کے لیے کسی خاص عمر کی تحدید قرآن سے ثابت نہ ہوگی، نہ بلوغ بمعنی حیض واحتلام، یا عمر خاص کا شرط نکاح بمعنی جماع ہونا اس سے ثابت ہوگا، اور اگر ''حق گو'' صاحب پہلی شق اختیار کریں گے، تو ان کو حدیث کا حجت ہونا بھی علی الرغم ماننا پڑے گا، اسی طرح اپنے اس فقرہ میں بھی کہ:

''اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک عورت بالغ نہ ہو''۔

انھوں نے خلط مبحث کر دیا، اس لیے کہ اگر یہاں بھی نکاح سے مراد خلوت ہے، تو یہ وہی پہلی بات ہوئی، لہٰذا تکرار بے فائدہ ہے، نیز اس کی یہ علت بیان کرنا کہ:

''ایجاب وقبول کے لیے بلوغ شرط ہے''۔

بالکل بے جوڑ بات ہے، ہر آدمی جانتا ہے کہ ایجاب وقبول کی ضرورت نکاح بمعنی عقد میں پیش آتی ہے، بلکہ نکاح بمعنی عقد اسی ایجاب وقبول کا دوسرا نام ہے، اور اگر یہاں نکاح سے مراد عقد ہے، تو گذارش ہے کہ آپ کے اس فقرہ میں کہ ایجاب وقبول میں بلوغ شرط ہے، کس کا ایجاب وقبول مراد ہے، اگر کہیے کہ میاں بیوی کا، تو جناب والا کو معلوم ہونا چاہیے کہ نابالغوں کے نکاح میں ایجاب وقبول ان کے ولی وسرپرست کرتے ہیں، اور انہی کے ایجاب وقبول کا جس کو وہ نابالغ کی جانب سے بحیثیت سرپرست کرتے ہیں، اعتبار کیا جاتا ہے، اور اگر کہیے کہ اولیاء اور سرپرستوں ہی کا ایجاب وقبول مراد ہے، تو صحیح ہے، لیکن ولی تو بالغ ہی ہوتا ہے، اور اسی کے ایجاب وقبول سے نابالغوں کا نکاح ہوتا ہے، پس میاں بیوی کی نابالغی کچھ مضر نہ ہوگی، پھر آپ نے یہ

کیسے لکھ دیا کہ اسلام میں نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک کہ عورت (۱) بالغ نہ ہو۔

ایجاب وقبول سرپرستوں کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ ولی کوئی چیز نہیں اور جب تک کہ میاں بیوی ایجاب وقبول نہ کریں، نکاح نہیں ہوسکتا، اور نابالغ ایجاب وقبول کے اہل نہیں ہیں، اس لیے نابالغوں کا نکاح ممکن نہیں ہے، تو یہ محض بے بنیاد و بے دلیل خیال ہے۔ مسلمانوں میں کوئی فرقہ آپ کا ہم خیال نہیں، نہ اس خیال کی تائید کسی حدیث سے ہوتی ہے، نہ آیت سے، بلکہ قرآن کی متعدد آیات سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے، ایک مقام پر ارشاد ہے: ﴿لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوا﴾ یعنی اے اولیاء! نہ نکاح کرو (اپنی بہن بیٹیوں کا) مشرکین سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں (یعنی جب وہ ایمان لائیں، تو اپنی لڑکیوں وغیرہ کو ان سے بیاہ سکتے ہو)، دیکھئے یہاں ولی وسرپرست مردوں کو خطاب کرکے یہ حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح میں ان کو بھی دخل ہے؛ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ﴾ یعنی اے سرپرستو! اپنے خاندان کی ان عورتوں کا جن کے شوہر نہیں ہیں، کسی سے نکاح کردو۔ اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ نکاح کردینے کا اختیار سرپرستوں کو بھی حاصل ہے، اگر ان کو کچھ اختیار نہ ہوتا تو بے وجہ یہ حکم نہ دیا جاتا۔

اور حدیثوں میں بصراحت یہ حکم مذکور ہے کہ نابالغوں کا نکاح سرپرستوں کے ایجاب وقبول سے ہوجاتا ہے۔

---

(۱) سورۂ طلاق کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالّٰٓئِیْ لَمْ يَحِضْنَ﴾ اس میں نابالغ لڑکیوں کی عدت بیان فرمائی گئی ہے، ظاہر ہے کہ اگر نابالغوں کا نکاح ناجائز ہوتا، تو ان کے لیے عدت کی بھی ضرورت نہ تھی، نابالغہ کی عدت کا ہونا اس امر کی روشن اور کھلی ہوئی دلیل ہے، کہ یہ نکاح جائز ہے، نہ معلوم منکرینِ حدیث کی عقلیں اس درجہ مسخ کیوں ہوگئی ہیں، کہ قرآن شریف کے ایسے آسان اور واضح مسائل کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (قاسمی عفا اللہ عنہ)

''حق گو'' کی دورنگی مجھے ''حق گو'' صاحب کی اس دورنگی پر تعجب ہے، کہ وہ نکاح کے لیے گواہوں کا ہونا تو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ گواہوں کی ضرورت بھی صرف حدیثوں سے ثابت ہے، قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، لیکن نابالغ کے نکاح کی صحت کو ولی کے ایجاب وقبول سے تسلیم نہیں کرتے، باوجودیکہ یہ حدیثوں کے علاوہ قرآن سے بھی ثابت ہے۔

''حق گو'' صاحب کا یہ قول بھی محتاجِ دلیل ہے، کہ عرب میں بلوغ کی عمر ہمیشہ ہندوستان سے زیادہ رہی ہے، ''حق گو'' صاحب نے کچھ نہ بتایا کہ ان کو اس کا کس طرح علم ہوا، اور اگر کہیں سے یہ ثابت بھی ہو جائے، تو آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

خلافِ عادت واقعات کیا دنیا میں عادت کے خلاف واقعات نہیں ہوتے، یہ موقع نہیں ورنہ میں آپ کے معصوم راویوں (یعنی عقلائے فرنگ) کی زبانی ایسے صدہا واقعات سناتا، اخبارات میں روزانہ ایسے واقعات کی اطلاعات شائع ہوتی رہتی ہیں، پس اگر فرض بھی کر لیجئے کہ عرب میں عموماً لڑکیاں ۹ برس میں بالغ نہ ہوتی ہوں، تو اس میں کیا استبعاد ہے کہ کوئی لڑکی خلافِ عادت ۹ ہی برس میں بالغ ہو جائے، ''حق گو'' صاحب کو تو یہی مستبعد معلوم ہوتا ہے، لیکن نہایت مستند طریق سے ثابت ہے کہ عرب میں بعض لڑکیاں نو برس (۱) کی عمر میں ماں اور اٹھارہ برس کی عمر میں نانی ہو گئی ہیں (دیکھو دارقطنی ص ۴۲۵)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی نسبت، قابلِ وثوق ذرائع سے معلوم ہے کہ ان کے جسمانی قویٰ بہت بہتر تھے، اور ان میں قوتِ نمو بہت زیادہ تھی، اس لیے

(۱) اخبار ''مدینہ'' بجنور مجریہ کیم جولائی ۱۹۳۴ء میں یہ خبر کامل تحقیقات کے بعد شائع ہوئی ہے کہ وکٹوریہ ہسپتال دہلی میں ایک سات سال سے کم عمر کی لڑکی نے ایک بچہ جنا ہے، جلت قدرتہ (اعظمی)

بہت تھوڑی عمر میں وہ قوت ان میں پیدا ہو گئی تھی، جو شوہر کے پاس جانے کے واسطے ایک عورت کے لیے ضروری ہے، داودی نے لکھا ہے: و کانت عائشة شبت شبابا حسنا یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بہت عمدگی کے ساتھ سن شباب تک ترقی کی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طبعی حالات تو ایسے تھے ہی، ان کی والدہ نے ان کے لیے ایسی غذا کا بھی خاص اہتمام کیا تھا کہ وہ جلد از جلد ترقی کر جائیں، چنانچہ ابوداود (۲/۹۸) اور ابن ماجہ (ص ۲۴۶) میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان مذکور ہے، کہ میری والدہ نے میری جسمانی ترقی کے لیے بہتیری تدبیریں کیں، آخر ایک تدبیر سے خاطر خواہ فائدہ ہوا، اور میرے جسمانی حالات میں بہترین انقلاب پیدا ہو گیا، اس کے ساتھ اس نکتہ کو بھی فراموش نہ کرنا چاہئے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خود ان کی والدہ نے بدون اس کے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے رخصتی کا تقاضا کیا گیا ہو، خدمتِ نبوی میں بھیجا تھا، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ پر کیا موقوف ہے، کوئی ماں اپنی بیٹی کی دشمن نہیں ہوتی، بلکہ لڑکی سب سے زیادہ اپنی ماں ہی کی عزیز و محبوب ہوتی ہے، اس لیے ناممکن ہے، کہ انھوں نے صلاحیت و اہلیت سے پہلے ان کو رخصت کیا ہو۔

اس حدیث کے غلط ہونے کی پہلی وجہ اس کے بعد ''حق گو'' صاحب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بعمر ۹ سالگی کی تردید چار وجہوں سے کرتے ہیں:

> ''اول حضرت اسماء حضرت عائشہ کی بہن ان سے دس سال بڑی تھیں، اور اسماء کی عمر انتقال کے وقت یعنی ۶۷ھ (''حق گو'' صاحب نے سنہ غلط نقل کیا ہے، ۷۳ھ ہونا چاہئے) میں سو سال سے متجاوز تھی (صحیح یہ ہے کہ سو سال تھی) حضرت اسماء کے بڑے صاحبزادے عبدالرحمن بن زبیر آنحضرت کے سامنے اس قدر جوان تھے کہ انھوں نے اس عورت سے

نکاح کیا، جس نے اپنے شوہر کی شکایت کرتے ہوئے ان کو کپڑے کے کھونٹ سے مشابہت دی تھی، بہر حال ہجرت کے سال اسماء کی عمر ۲۵ یا ۲۶ سال سے کم نہ تھی، اور اس لیے حضرت عائشہ کا سن منگنی کے وقت ۱۶ سال اور نکاح کے وقت ۱۹ سال تھا"

"حق گو" کی "اعلیٰ قابلیت" کے چند نمونے "حق گو" صاحب نے اس وجہ میں اپنی قابلیت کی خوب خوب نمائش کی ہے، اکمال سے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا سنِ وفات ۶۷ھ نقل کیا، حالانکہ اس میں ۷۳ھ مذکور ہے، اسی کتاب سے ان کی عمر سو سال سے متجاوز بتائی، حالانکہ اس میں سو ہی کا ذکر ہے، ہجرت کے وقت حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عمر ۲۵-۲۶ سال بتائی، حالانکہ خود ان کی تحریر کے مطابق ۲۴ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر منگنی کے وقت ۱۶/۱۷ سال بتائی، حالانکہ ان کی تحریر سے ہجرت کے وقت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ عمر ثابت نہیں ہوتی، بلکہ ۱۶ کے بجائے ۱۴ سال ثابت ہوتی ہے، اور چونکہ تاریخوں سے ثابت ہے، کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی منگنی یعنی عقد ہو چکا تھا، (دیکھو زرقانی و فتح وغیرہ) پس "حق گو" صاحب کے مقدمات کی بنا پر منگنی کے وقت ۱۱، اور رخصتی کے وقت ۱۴/ سال کی عمر ثابت ہوگی، اور سب سے بڑھ کر لطیفہ یہ ہے کہ "حق گو" صاحب نے ان عبدالرحمٰن بن الزبیر رضی اللہ عنہ کو جن کی بی بی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی تھی، حضرت اسماءؓ کا بیٹا لکھ دیا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، یہ عبدالرحمٰن نہ اسماءؓ کے بیٹے ہیں، نہ زبیر بن العوام شوہر اسماءؓ کے، بلکہ وہ زبیر (بروزن کریم) ابن باطیا کے بیٹے ہیں (دیکھو فتح الباری ۳۷۵/۵)۔

"حق گو" صاحب کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سطروں میں انھوں نے پانچ فاش غلطیاں کی ہیں۔

اکمال کی عبارت پر بحث اس کے بعد اب اصل بحث پر یہ گفتگو ہے، کہ بے شبہہ اکمال کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی چودہ سال کی عمر میں ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ صاحبِ اکمال نے اس عبارت میں کہیں ضرور غلطی کی ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ۹/سال بڑی ہوں، اس لیے کہ اکمال کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماءؓ کی عمر ہجرت کے سال ۲۷/برس کی تھی، اور مستدرک حاکم وغیرہ میں ہے کہ زبیر کی عمر اس وقت ۱۸/سال کی تھی، نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پہلو نٹے ہیں، اور ان کی پیدائش ہجرت کے پہلے ہی سال میں ہوئی، پس اگر ہجرت کے سال حضرت اسماءؓ کی عمر ستائیس سال ہو تو نہایت مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ پہلو نٹے ہوں، اور ان سے پہلے حضرت اسماءؓ کے ۲۷ سال تک کوئی اولاد نہ ہوئی ہو، اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود ان کے دو کلاموں میں سخت تعارض واقع ہو جائے گا، اس لیے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے حال میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، اس سے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر ہجرت کے سال ۱۷ برس ثابت ہوتی ہے، لیکن خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حال میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد یا سات ماہ بعد ان کی عمر ۹/سال کی تھی، پھر دوسرا تعارض یہ ہے کہ ان کے پہلے قول کی بنا پر وفات نبوی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۲۷ سال ہوگی، لیکن حضرت عائشہؓ کے حال میں خود انہیں نے تصریح کی ہے کہ ”اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی“، پس جب ان کے کلام میں تعارض واقع ہو گیا، تو ان کا کلام قابلِ استدلال نہ رہا۔

دوسری وجہ اس کے بعد ”حق گو“ صاحب کی دوسری وجہ ملاحظہ ہو:

”عبدالرحمن بن ابی بکر فتوحات شام میں قائد اعظم (سپہ سالار) تھے،

اور وہ حضرت عائشہ سے سن میں اس قدر چھوٹے تھے کہ حضرت عائشہ ان کو وضو کا طریقہ سکھایا کرتی تھیں، پس اگر حضرت عائشہ کا سن ہجرت میں ۹؍ سال رکھا جائے، تو اس حساب سے عبدالرحمٰن کی قیادت فتوحات شام میں اس قدر کم سنی میں پائی جاتی ہے کہ محال ہے، فتوحاتِ شام ۱۶ھ کا واقعہ ہے''

''حق گو'' کے تاریخی معلومات کی رسوائی

''حق گو'' صاحب نے اس وجہ کو ذکر کر کے اپنی تاریخ دانی کو حد درجہ رسوا کر دیا، اولاً: تو حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا، اپنے تمام بھائی بہنوں سے بڑے تھے، اور کتابوں کا ذکر چھوڑیئے، خود اسی اکمال میں جس کا حوالہ ''حق گو'' صاحب نے پہلی وجہ میں دیا ہے مذکور ہے، **وکان أسنَّ وُلدِ أبي بکر** (یعنی) یہ اولادِ ابوبکر میں سب سے بڑے تھے، حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے دوسری وجہ لکھتے وقت اکمال کی طرف مراجعت کیوں نہیں کی؛ ثانیاً: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے طریقۂ وضو سکھانے کا جو ذکر انھوں نے کیا ہے، اس کی اصلیت یہ ہے کہ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، اور پانی مانگ کر وضو کرنے لگے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اعضاء کو اچھی طرح اور پورا دھویئے، اس واقعہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شاید حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جلدی میں وضو کیا، اور کوئی جگہ خشک رہ گئی، اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بالکل اسی طرح جس طرح کوئی چھوٹا آدمی اپنے بڑے کو اس کی بھول وچوک پر متنبہ کر دیتا ہے، حضرت عبدالرحمٰنؓ کو ٹوک دیا، حدیث و تاریخ میں اس قسم کے سدہا واقعات ہیں، کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے سے بہت معمر صحابیوں کو بہتیری باتیں بتائیں، تو کیا وہ سب صحابہؓ ان سے کمسن قرار پائیں گے؛ ثالثاً: اگر بالفرض حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھوٹے بھی ہوں، تو فتوحاتِ

شام میں ان کی قیادت محال تو درکنار مستبعد بھی نہیں ہے، ''حق گو'' صاحب کے نزدیک اگر وضو کا طریقہ سکھانے کی وجہ سے حضرت عبدالرحمٰن کا چھوٹا ہونا ضروری ہو، تو اس کے لیے ۹/برس چھوٹا ہونا اُن کے نزدیک بھی بہت کافی ہوگا، لیکن اس تقدیر پر بھی فتوحاتِ شام کے ایام میں اُن کی عمر ۱۶/سال ہوگی، جو قابلیتِ قیادت کے لیے بہت کافی ہے، ''حق گو'' صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ قیادتِ جنگ کے لیے پیرفانی ہونا شرط نہیں ہے، قابل ہونا چاہئے، خواہ وہ نوجوان ہی ہو، اور اس کے لیے اُن کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت کا واقعہ پڑھنا چاہئے، جن کو خود آنحضرت ﷺ نے قائد مقرر کیا تھا، باوجودیکہ اس وقت ان کی عمر ۱۸ یا ۲۰ سال تھی (اصابہ)۔

تیسری وجہ ''حق گو'' صاحب نے یہ ذکر کی ہے:

> ''یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگِ جمل میں شرکت کی، اور قرآن سے ظاہر ہے کہ امہات المومنین کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں، تاوقتیکہ وہ مستثنیات میں داخل نہ ہو جائیں، یعنی بوڑھی نہ ہو جائیں، پس اگر ان کی مفروضہ عمر (یعنی ۹ سال رخصتی کے وقت) تسلیم کر لی جائے، تو جنگِ جمل میں اُن کا بڑھاپا نہ آیا، (لہذا قرآن کی مخالفت لازم آئے گی)
> اور یہ حضرت عائشہ سے نہایت بعید ہے''

اس کا جواب ''حق گو'' صاحب کی یہ وجہ بھی ان کے قلتِ تدبر کی شرمندۂ احسان ہے، قرآن پاک میں ازواجِ مطہرات کو گھر سے نکلنے کی ممانعت مطلق نہیں ہے، بلکہ یہ ممانعت اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے، کہ زمانہ جاہلیت کے انداز پر نکلنا ہو، یعنی زیب و زینت کے ساتھ رنگین لباسوں میں ملبوس ہو کر بے پردہ نکلنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کے صریح الفاظ ہیں:

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ   یعنی اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور جاہلیتِ

تبرّج الجاهلیۃ الاولیٰ   قدیم کے انداز پر بناؤ سنگار کر کے نہ نکلو۔

لہٰذا جب بے بناؤ سنگار کے اور باپردہ نکلنے کو قرآن نے منع نہیں کیا، تو حضرت عائشہؓ چاہے جس سن میں بھی جنگِ جمل میں شریک ہوئی ہوں، اس آیت کی مخالفت لازم نہیں آسکتی، اور نہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکلنا قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے، تاریخوں سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہودج میں سوار ہو کر پورے پردہ کے ساتھ گئی تھیں، ''حق گو'' صاحب نے اس پر بھی غور نہ کیا کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ خود ازواجِ مطہرات کو لے کر حج وعمرہ کے لیے گھر سے نکلے؛ پس اگر یہ حکم مطلق ہوتا، تو کیوں کر ممکن تھا کہ آنحضرت ﷺ ان کو لے کر جاتے۔

پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ قرآن میں اس آیت کے بعد ایک اور آیت بھی ہے، جس میں ازواجِ مطہرات کو گھونگھٹ نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، پس اگر ان کے لیے باہر نکلنا قطعاً ممنوع ہے، تو گھونگھٹ نکالنے کا حکم دینا بے ضرورت ہوگا، اس لیے کہ اس کی ضرورت تو باہر ہی نکلنے میں پیش آسکتی ہے۔

اچھا ان سب باتوں کو جانے دیجئے اور فرض کر لیجیے کہ ''حق گو'' صاحب کے تمام مقدمات صحیح ہیں، جب بھی تو ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کہ جنگِ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا نہ آیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ ''حق گو'' صاحب کو واقفیت نہیں ہے، کہ جنگِ جمل ۳۶ھ کا واقعہ ہے، اور رخصتی کے وقت اگر ان کی عمر ۹/ سال مانی جائے، تو جنگِ جمل میں انکی عمر ۴۵/ سال ہوتی ہے، اس عمر کو خود ''حق گو'' صاحب بڑھاپے کی عمر مانتے ہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ وہ اسی رسالہ کے صفحہ ۸ میں لکھ چکے ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ اپنی ساری جوانی ایک بوڑھی بیوہ کے ساتھ گذار چکے تھے''۔

ظاہر ہے کہ ''اس بوڑھی بیوہ'' سے مراد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں، اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ ان کی عمر نکاح کے وقت ۴۵ رسال سے کسی طرح زیادہ نہ تھی، بلکہ اکثر اصحابِ سیرت کے قول پر ۴۰ رسال سے زیادہ نہ تھی۔

پس حیرت ہے کہ جب بقول ''حق گو'' صاحب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا ۴۰ رسال کی عمر میں آ گیا تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بڑھاپا ۴۵ رسال کی عمر میں کیسے نہیں آیا؟

چوتھی وجہ اس کے بعد ''حق گو'' صاحب نے چوتھی وجہ یہ ذکر کی ہے:

''عمروں کے متعلق روایتیں نہایت متضاد ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضرت فاطمہ کا کس سنہ میں انتقال ہوا اور ان کیا عمر تھی؟ حضرت عائشہ کی (رحلت) کے متعلق روایات مختلف ہیں''۔

اختلافِ روایات سے کوئی فن بے اعتبار نہیں ہو سکتا ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عمروں کے متعلق روایات مختلف ہوتی ہیں، لیکن تنقیدِ روایات کے اصول سے محقق اور راجح بات کا پتہ چل جاتا ہے، لہٰذا اس اختلاف کی بنا پر فن بے اعتبار نہیں ہو سکتا، علاوہ بریں یہاں اس تضاد کا ذکر بالکل بے محل ہے، اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بعمر ۹ رسال کے خلاف کوئی روایت موجود ہی نہیں، صحیحین کے علاوہ اور جہاں جہاں ان کی رخصتی کا ذکر ہے، سب جگہ ۹ رہی سال میں رخصتی کو لکھا ہے، کیا ''حق گو'' صاحب اس کے خلاف کوئی روایت پیش کر سکتے ہیں؟

’’حق گو‘‘ صاحب کے ملحدانہ ہذیانات

مذکورہ بالا سات عنوانوں کے بعد ’’حق گو‘‘ صاحب نے چند اور دلآزار عنوان قائم کیے ہیں، اور ان کے ماتحت نہایت آزادی سے اپنے ملحدانہ خیالات کو ظاہر کیا ہے، اور محدثین کرام وفقہاء اسلام رحمۃ اللہ علیہم پر خوب گندگیاں اچھالی ہیں، یہ عنوانات بجائے خود ان کی بے دینی والحاد کے مستقل دلائل ہیں، چند عنوان ملاحظہ ہوں: ’’یہودیت و حدیث‘‘، ’’مسیحیت و حدیث‘‘، اور ’’حدیث و مجوسیت‘‘۔ ان عنوانات کے ماتحت ’’حق گو‘‘ صاحب نے یہ بیان کیا ہے، کہ حدیث کا تمام تر سرمایہ انھی غیر مسلم قوموں سے ہاتھ آیا ہے، اور محدثین نے انہیں قوموں کی باتوں کو سن سن کر اور ہر بات کے لیے ایک فرضی اِسناد بنا کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اپنے تخیلات فاسدہ اور توہمات باطلہ کے سوا اس بیان کی کوئی دلیل انھوں نے ذکر نہیں کی؛ پس اس حالت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی باتیں کہاں تک قابلِ التفات وتوجہ ہو سکتی ہیں، کیا ’’حق گو‘‘ صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی داں طبقہ جس میں وہ اپنے ملحدانہ خیالات کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں، ان کی ہر بے دلیل بات اور بے ثبوت دعویٰ کو قبول کر لے گا؟ کیا یہ طبقہ تاریخی حقائق کے خلاف آپ کے بے بنیاد مزعومات کو بے تامل مان لے گا؟ ہم کو حیرت ہے کہ ’’حق گو‘‘ صاحب نے اس طبقہ کی نسبت یہ خیال کیسے قائم کر لیا، اور مستند تاریخی بیانات کے خلاف ان کو یہ لکھنے کی کیوں کر جرأت ہوئی کہ:

’’خلفاء راشدین کے زمانہ میں اور خصوصاً حضرت عمر کے سامنے کسی کی مجال نہ پڑتی تھی، کہ وہ کوئی حدیث بیان کرے اور یقینی بات ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے قبل تک لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جو سنگین واقعات

اس سے پہلے پیش آئے، مثلاً: شہادت امام حسین وعبداللہ بن زبیر وفتنہ وبغاوت بزمانہ عثمان اور جنگِ جمل وغیرہ، ان میں سے ایک کا بھی اشارہ قیامت کی پیشین گوئیوں کے سلسلہ میں نہیں ہے''

صحابہؓ کی روایت حدیث اور ان کا حدیث کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ''حق گو'' صاحب نے ان سطروں میں جن تاریخی حقائق کا انکار کیا ہے، ان کے انکار کی جرأت کوئی حیادار انسان نہیں کرسکتا، خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے خود حدیثیں بیان کی ہیں، اور دوسرے صحابہؓ سے بہت سے مقدمات میں حدیثیں دریافت کر کے ان کے مطابق فیصلے کیے ہیں، تاریخ الخلفاء تاریخ کی چھوٹی سی کتاب ہے، اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کی ہوئی ایک سو چار حدیثوں کا ذکر موجود ہے، اور تاریخوں میں یہ بھی بصراحت مذکور ہے کہ جب صحابہؓ میں اختلاف ہوا، کہ آنحضرت ﷺ کو کہاں دفن کیا جائے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنا کر اس اختلاف کو رفع کیا، پھر خلافت کے مسئلہ میں انصار ومہاجرین کا اختلاف ہوا، تو اس موقع پر بھی انصار کے مناقب اور قریش کے استحقاقِ خلافت کی حدیثیں سنا کر دونوں گروہوں کو متفق کر دیا، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حدیثوں کی روایت کی ہے، اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ان کے سامنے روایتِ حدیث کی ہے۔

روایت حدیث میں صحابہؓ کی احتیاط ہاں اتنا ضرور ہے کہ حضرت شیخین خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت تاکید تھی، کہ حدیثوں کے بیان کرنے میں بے احتیاطی نہ کی جائے، خوب غور وفکر کر کے صحیح بات بیان کی جائے، ایسا نہ ہو کہ زیادہ گوئی میں کوئی غلط بات آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہو جائے، یہ ساری باتیں علامہ سیوطیؒ وعلامہ ذہبیؒ وغیرہ کی تاریخی تصنیفات میں تفصیل سے مذکور ہیں، اور یہی حال حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کا بھی تھا؛ لہذا یہ کہنا کہ

''حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے لوگ حدیثوں کو نہ جانتے تھے''

ایسا جھوٹ ہے، جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں ہے، ''حق گو'' صاحب کو اگر عربی کتابوں پر دسترس حاصل نہ تھا، تو کم از کم سیرۃ النبی کا مقدمہ ہی ملاحظہ کر لیتے، ہندوستان کا یہ وسیع النظر مؤرخ کتنی صراحت سے لکھتا ہے کہ:

''صحابہ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، اور بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا، زیادہ تر زبانی تھا۔''

اس کے بعد بنو امیہ کے عہد میں تصنیف و تالیف کے شروع ہونے کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، تو انھوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔''

ان اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ:

۱- صحابہ و خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں بکثرت احادیث کی روایت ہوئی۔

۲- کچھ حدیثیں قیدِ کتابت میں بھی آئیں، لیکن زیادہ تر زبانی روایت ہوتی تھی۔

۳- حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے پہلے ہی تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

۴- حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں تصنیف کو ترقی ہوئی۔

لہذا ''حق گو'' صاحب کا یہ کہنا کہ:

''حدیث کی سب سے پہلی کتاب جو مدون ہوئی، وہ ابن جریج المتوفی

۱۵۰ھ کی ہے۔"

بالکل غلط ہے، اس لیے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اس سے پہلے بھی حدیث کی کتابیں لکھوا چکے تھے، اور ان کا زمانہ خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک ہے، بلکہ ان سے پہلے بھی تصنیفیں ہو چکی تھیں۔

مغازی پر حملہ

بہر حال ''حق گو'' صاحب کے مذکورہ بالا بیان کے غلط ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن اب اس کو چھوڑیے اور ان کی یہ بات یاد رکھئے کہ:

''عمر بن عبدالعزیز سے پہلے کوئی حدیثوں کو جانتا نہ تھا''

اور اس کے بعد ان کا دوسرا بیان پڑھئے، لکھتے ہیں:

''ایک ہی صدی کے بعد ...... وضعِ حدیث کی گرم بازاری ہوئی ...... مسلمانوں کا پہلا دور فتوحاتِ ملکی اور سیاست کا تھا، اس دور میں اگر انھوں نے رسول اللہ کی مبارک سیرت کے کسی شعبہ سے اعتنا کیا ہے، تو وہ آپ کی سنیت و عبادت نہیں ہے، بلکہ مغازیات ہے، ...... لیکن جس شخص نے اس پر سب سے پہلے نظر ڈالی ہے، وہ اپنی روایتوں میں حد درجہ ناقابلِ اعتبار ہے، اور یقیناً سلاطینِ وقت کی عام خونریزیاں اور یہودیوں کی وہ خرافات واتہام جو وہ داود اور سلیمان اور یوشع پر لگاتے تھے، ان کی صدائے بازگشت ان مغازیات میں ہے''۔

''حق گو'' صاحب کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھئے اور بتایئے کہ بجز اس شخص کے جس کے دماغ میں خلل ہو، کسی اور کے قلم سے ایسی باتیں نکل سکتی ہیں، میں ''حق گو'' صاحب سے پوچھتا ہوں کہ وفاتِ نبوی کے بعد مسلمانوں کا پہلا دور تو خلافتِ راشدہ کا دور ہے، تو کیا اسی زمانہ میں مغازی رسول ﷺ کی تصنیف شروع ہوئی ہے؟ اور کیا اس دور میں بھی لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی سنت وعبادت کے ساتھ اعتنا نہیں تھا؟ اور کیا خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی عام خونریزی اور جبر واستبداد جاری تھا؟

مغازی کی طرف سب سے پہلے کس نے توجہ کی؟ حالانکہ فن تاریخ کا ابجد خواں بھی جانتا ہے کہ مغازی کی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں توجہ ہوئی، اور اسی زمانہ میں امام زہری المتوفی ۱۲۴ھ نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور ان

کے بعد ان کے شاگرد موسیٰ بن عقبہ المتوفی ۱۴۱ھ، اور ابن اسحٰق المتوفی ۱۵۲ھ نے اس پر کتابیں لکھیں؛ پس اس بنا پر مغازی پر پہلے نظر ڈالنے والے زہری ہیں، اور وہ بالاتفاق معتبر اور قابلِ استناد راوی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے اپنی بے بضاعتی کے باعث یہ سمجھ رکھا ہے، کہ مغازی پر سب سے پہلے نظر ڈالنے والا واقدی ہے، اور وہ دورِ اول کا آدمی ہے، حالانکہ واقدی کو دورِ اول سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ تو زہری کے شاگردوں سے بھی متاخر ہیں، واقدی کی وفات ۲۰۷ھ میں ہوئی (۱)۔

''حق گو'' دشمنانِ اسلام کی صف میں اس کے بعد فرماتے ہیں:

''اس کے بعد نظام ملکی کے لیے فقہ کی ضرورت ہوئی، اگرچہ اس کا مواد زیادہ تر رومیوں اور ایرانیوں کے متداولہ قوانین سے آیا ہے، لیکن ان کی سند راویوں کے سلسلہ سے رسول اللہ تک پہنچا دی گئی ہے''۔

اس اقتباس کو پڑھ کر انصاف سے کہئے کہ ''حق گو'' صاحب اپنی اسلام دشمنی میں متعصب غیر مسلموں سے بھی دو قدم آگے ہیں یا نہیں؟ اللہ اللہ! ''حق گو'' صاحب مسلمان کہلا کر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام کا قانون نہایت نامکمل تھا، اس میں نظام ملکی کے قوانین نہیں تھے، اور قرآن و مبلغ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو آئینِ حکومت و نظامِ سلطنت نہ بتائے تھے، اور مسلمانوں کو اس کے لیے دوسروں کا محتاج اور دستِ نگر رکھا تھا، چنانچہ اسی بے آئینی کے ساتھ حضرت ابوبکر نے، حضرت عمر نے، حضرت عثمان نے، حضرت علی نے اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہم) نے اور ان تمام خلفاء کے عمال نے، بلکہ ایک صدی کے بعد تک تمام خلفاء و امراء نے حکومت کی، ایک صدی کے بعد جب ایرانیوں اور رومیوں کے قوانین سے سرقہ کیا گیا، تو اس وقت مسلمانوں کے قوانین نظام حکومت مرتب ہوئے، بتائیے کہ ایک غیر مسلم اس سے زیادہ اسلام کی اور کیا توہین کر سکتا ہے؟

(۱) کتابتِ حدیث کی مکمل تاریخ مقدمہ میں ملاحظہ کیجئے ۱۲ منہ۔

اسلامی قوانین کی اکملیت

افسوس ہے کہ ''حق گو'' صاحب کو شرم نہیں معلوم ہوتی، کہ وہ مدعی اسلام ہو کر یہ بک رہے ہیں، اور ایک غیر مسلم ''موسیو ادجین کلوفل'' یہ لکھ رہا ہے، کہ:

''جب کوئی شخص قرآن کی آیتوں کو اس طرح مرتب کرے گا، تو وہ ہماری طرح یقیناً ذیل کے نتائج پر پہنچے گا:

(اول) یہ کہ محمد (ﷺ) نے ایک کامل مجموعہ تمدنی قوانین کا دنیا کے سامنے پیش کیا ہے''۔

اور مشہور مسیحی مؤرخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے:

''بحر اوقیانوس سے لے کر دریائے گنگا تک الغرض مشرق سے لے کر مغرب تک قرآن مجید کو نہ صرف اصولِ دین کے لیے قانونِ اساسی تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے، کہ احکام، تعزیرات، اصولِ تمدن و اجتماع، قوانینِ معاشرت، انسانی زندگی کے مختلف نظامات اور ان کی ترتیب بیان کرنے کے لیے ایک جامع کتاب ہے .... خلاصہ یہ کہ شریعتِ محمدیہ کی بنیاد ایسے مستحکم اور مضبوط اصول پر قائم کی گئی ہے، جس کی نظیر تمام دنیا کے ادیان و مذاہب میں نہیں پائی جاتی''۔

اور مسٹر ای ڈی مارل لکھتا ہے:

''اسلام افریقہ کے حبشیوں کے دلوں میں تہذیب و شائستگی کی روح پھونکنے، سِوِل گورنمنٹ کا نظام اور حدودِ عدالت کے قائم کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا ہے، قرآن ہی پیروانِ اسلام کا قانونِ اساسی ہے، اور وہی ان کا دستور العمل اور ان کے حقوق کی دستاویز ہے، اکثر اوقات اس

امر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، کہ اسلام نہ صرف ایک مذہب کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ وہ ایک نظامِ تمدن بھی ہے۔''

اور موسیو لیون راس لکھتا ہے کہ:

''اسلام ایک جامع الکمالات قانون ہے، جس کو انسانی، طبعی، اقتصادی، اور اخلاقی قانون کہنا بالکل بجا اور درست ہے، زمانۂ حال میں جتنے قوانین نوع انسان کی فلاح کے لیے وضع کیے گئے ہیں، وہ سب اس مقدس مذہب میں پہلے سے مفصل موجود ہیں۔''

اس قسم کے اقوال کہاں تک نقل کیے جائیں، خلاصہ یہ ہے کہ ہر بابصیرت انسان چاہے وہ موافق ہو یا مخالف، جانتا ہے کہ قانونِ اسلامی نہایت اکمل اور تمام قوانین سے اعلیٰ وارفع قانون ہے، اور اسلام کا پیرو انسان دنیا کے کسی قانون کا محتاج نہیں ہے، قرآن زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح و بقاو ترقی کے قوانین پر مشتمل ہے، اور اس قانون کے مبلغ علیہ السلام نے اپنے قول و فعل سے پوری تشریح کر کے تمام قانون سے بے نیاز کر دیا ہے۔

شریعت اسلامیہ کی توہین پس جب مخالفین کی تصریحات سے ثابت ہو گیا، کہ اسلام نظامِ ملکی یا ضروریاتِ مذہبی کسی چیز میں بھی کسی دوسرے کا محتاج نہیں، تو ''حق گو'' صاحب کا یہ لکھنا اسلام کی صریح توہین، اور اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دینا ہے یا نہیں کہ:

''مذہبی مسائل میں بالکل یہود کے مذہبی مسائل کی تقلید ہونے لگی، اور جب مذہبی قانون بننا شروع ہوا، تو اس سے زیادہ آسان بات کیا ہو سکتی تھی کہ ہر ایسے مسئلہ میں جس پر قرآن نے کچھ نہ کہا ہو، اور جس پر سنتِ متواترہ اور مسلمانوں کا عمل بھی نہیں ہے، اس کو یہود و نصاریٰ سے لے کر اس پر

فرضی سند لگا کر حدیثِ رسول کے نام سے پیش کر دیا جائے ..... نتیجہ یہ ہوا کہ دو صدی کے اندر یہود کی پوری شریعت اپنے نئے چولے میں مسلمانوں پر ڈال دی گئی'' (رسالہ منکرینِ حدیث ص ۱۱)

شریعتِ اسلامیہ کی اس سے زیادہ توہین کیا ہوسکتی ہے، کہ ''حق گو'' صاحب کے زعم فاسد میں قرآن اور مبلغ علیہ السلام کی شریعت اتنی ناقص تھی کہ نہ اس میں قوانینِ ملکی تھے، نہ مسائل مذہبی، اس لیے قوانینِ حکومت کو تو مسلمانوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے چرایا، اور مسائلِ مذہبی کا یہود و نصاریٰ سے سرقہ کیا۔

اگر ''حق گو'' صاحب کہیں کہ میں ان چیزوں کی کلیۃً نفی نہیں کرتا، بلکہ یہ کہتا ہوں کہ کچھ باتیں مذہب و سیاست کی اسلام میں تھیں، اور جو نہیں تھیں، ان کو غیروں سے لیا گیا .... تو میں عرض کروں گا کہ پھر قرآن نے یہ دعویٰ کیوں کیا ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ نیز مخالفینِ اسلام کے اقوال سے ابھی ثابت کیا جا چکا ہے، کہ اسلام سے زیادہ مکمل مذہب و قانون دوسرا کوئی مذہب و قانون نہیں ہے، پس اسلامیوں کو یہود و نصاریٰ یا رومی و ایرانی قوموں سے کچھ اخذ کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آسکتی ہے، ''حق گو'' صاحب اب بھی ہوش میں آؤ، اور دیکھو کہ حدیثوں سے دشمنی کر کے تم اسلام کے بھی دشمن ہو گئے یا نہیں؟

ابن خلدون کی عبارت کے ترجمہ میں ''حق گو'' صاحب کی خیانت

اس مقام پر پہنچ کر یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے اس مطلب پر کہ:

''مسلمانوں نے یہودیوں سے باتیں سیکھ کر داخلِ مذہب کر لیں''

مقدمہ ابن خلدون کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اس عبارت کے ترجمہ میں بدترین خیانت سے کام لیا ہے، سنئے! قصہ

یوں ہے کہ بعض مفسرین نے کتبِ تفاسیر میں کچھ اسرائیلی اقوال نقل کر دیے ہیں، ان تفسیروں کے ذکر کے سلسلہ میں ابن خلدون نے یہ لکھا ہے کہ:

''اسلام سے پہلے عرب کے پاس نہ کوئی کتاب آسمانی تھی، نہ علم تھا، اس لیے جب ان کو موجودات کے اسباب اور کائنات کی پیدائش کی ابتدا اور وجود کے اسرار کی نسبت کچھ معلوم کرنے کا شوق ہوتا تھا، تو یہود و نصاریٰ سے پوچھ لیتے، پس جب اسلام لائے، تو جن چیزوں کا تعلق احکام شرعیہ سے نہ تھا، وہ چیزیں ان میں باقی رہ گئیں، مثلاً کائنات کی پیدائش کی ابتداء وغیرہ''۔

ابن خلدون کے اس کلام میں مصرح ہے، کہ یہودیوں سے دریافت کرنے کا قصہ اسلام سے پہلے کا ہے، اور یہ بھی مصرح ہے کہ یہودیوں کی صرف وہی باتیں ان مخصوص مسلمانوں میں رہ گئی تھیں، جن کا کوئی تعلق احکامِ شرعیہ سے نہ تھا، اور وہ ایسی باتیں تھیں، کہ ان کے لیے احکامِ شرعیہ کی سی احتیاط کی ضرورت نہ تھی، اور یہ کہ ان باتوں پر وہی قائم رہے، جنھوں نے پوچھا تھا، یہ نہیں کہ سب مسلمانوں نے ان کو تسلیم کر لیا، اور یہ کہ ابن خلدون نے یہ بات کتبِ تفسیر کے اسرائیلی اقوال کی نسبت لکھی ہے، مگر ''حق گو'' صاحب نے غایت ''دیانتداری'' سے اس کلام کو ''یہودیت و حدیث'' کے عنوان کے ماتحت درج کیا، اور ابن خلدون کے اس فقرہ: **فلما أسلموا بقوا على ما كان عندهم مما لا تعلق له بالأحكام الشرعية التي يحتاطون لها مثل أخبار بدء الخليقة الخ** کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ:

''جب مسلمان ہوئے تو جن باتوں کی احکامِ شریعت سے احتیاط کی جاتی تھی، تعلق نہ بنا، مثلاً ابتدائے خلق اور قربِ قیامت کی نشانیاں اور فتن کی خبریں، وہ سب ان کی وجہ سے مسلمانوں میں اب تک رہ گئیں''

حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ:

''جب وہ مسلمان ہوئے، تو وہ احکامِ شرعیہ جن کے لیے وہ احتیاط برتا کرتے تھے، ان سے جن باتوں کا تعلق نہ تھا، ان باتوں پر قائم رہ گئے''

حاصلِ کلام یہ کہ ابن خلدون کا یہ کلام حدیث کی نسبت نہیں ہے، بلکہ بعض تفسیروں کے اسرائیلی اقوال کی نسبت ہے، اور وہ اقوال احکامِ شرعیہ سے متعلق نہیں ہیں، لہٰذا یہاں اس کلام کو پیش کرنا خیانت ہے، پھر یہ بھی سن لیجئے کہ ان اسرائیلی اقوال کو علماءِ ملت نے قبول نہیں کیا، چنانچہ خود اسی مقدمہ میں آگے چل کر مصرح ہے، کہ پچھلے مفسرین نے تحقیق و تمحیص کر کے ان اقوال کو نکال ڈالا۔

یہود و نصاریٰ سے مسائل اخذ کرنے کی ممانعت حدیث میں

''حق گو'' صاحب نے مسلمانوں پر یہ الزام لگا تو دیا، کہ انھوں نے یہود و نصاریٰ سے مسائل اخذ کیے، لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ اس کا ثبوت نہیں پیش کر سکے، اور نہ اس کے لیے کوئی تاریخی شہادت ہی ذکر کی، بلکہ آپ نے دیکھ لیا، کہ ان کا یہ الزام قرآن کے خلاف، بلکہ ان غیر مسلموں کی تصریحات کے بھی خلاف ہے، جن کو ''حق گو'' صاحب بالکل معصوم تصور کرتے ہیں، اب میں ''حق گو'' صاحب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ عقل سے ذرا کام لیتے، تو یہ الزام قائم کرنے کی ان کو جرأت نہ ہوتی، انھوں نے حدیث کا مطالعہ کیا ہوگا، تو ان کو معلوم ہوگا کہ متعدد احادیث میں یہود و نصاریٰ سے اخذِ مسائل کرنے کی ممانعت مصرح ہے، اور ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک سب حدیثیں بناوٹی ہیں، تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب واضعینِ حدیث نے یہود و نصاریٰ سے مسائل حاصل کیے، اور ان کی پوری شریعت کو ایک نئے قالب میں ڈھال دیا، تو پھر انھوں نے یہ حدیثیں کیوں وضع کیں، یہ حدیثیں تو ان مقاصد کے لیے بے حد مضر ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آنحضرت ﷺ سے کہا کہ ہم یہودیوں کی باتیں سنتے ہیں، تو ہم کو بہت بھلی لگتی ہیں، اجازت دیجئے تو ہم ان کو لکھ لیں، آنحضرت ﷺ یہ سن کر بہت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ ان کی طرح کیا تم کو بھی اپنی تشفی کے لیے غیروں کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت ہے، حالانکہ میں تو جو شریعت لایا ہوں، وہ بالکل روشن اور صاف سیدھی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے، تو ان کو

میرے اتباع کے بغیر چارہ نہیں ہوتا، مطلب یہ ہے کہ تم کو اپنے نبی اور اپنی کتاب کے سوا کسی دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے، ''حق گو'' صاحب اس حدیث کو پڑھیں اور بتائیں کہ یہ حدیث لوگوں نے کیوں ''وضع'' کی، اور اس کو ''وضع'' کر کے خواہ مخواہ اپنے پاؤں میں کیوں کلہاڑی ماری؟

اس مضمون کی اور حدیثیں بھی ہیں، منجملہ ان کے ایک وہ حدیث بھی ہے، جس کو ''حق گو'' صاحب نے ص ۱۲ میں نقل کیا ہے کہ:

> ''اہلِ کتاب اپنی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کو عہدِ نبوی میں سنایا کرتے تھے، تو آنحضرت نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی باتوں کو جھوٹی بھی نہ کہو، لیکن اس کی تصدیق بھی نہ کرو''

''حق گو'' صاحب اس حدیث کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کو مدینہ کا نہیں، بلکہ شام کا واقعہ قرار دیتے ہیں، یعنی عہدِ نبوی کے بعد جب شام فتح ہوا ہے، لیکن سوال ہے کہ اس وقت آنحضرت ﷺ کہاں تھے، جو مذکورہ بالا حکم فرماتے؟

''حق گو'' صاحب نے اس کو شام کا واقعہ اس لیے قرار دیا ہے، کہ جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ آئے ہیں، اس وقت یہود مدینہ سے نکل چکے تھے، لیکن ''حق گو'' صاحب کا یہ استدلال غلط ہے، اس لیے کہ اس سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کا نہیں ہے، لیکن یہ کہتا کون ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کا ہے، واقعہ ان کے آنے سے پہلے کا ہے، لیکن جب وہ مدینہ میں آئے، تو ان سے کسی نے بیان کیا، تو انھوں نے اس بیان کی حکایت کر دی، اسی طرح صدہا واقعات انھوں نے بیان کیے ہیں، اور ہم کو تو ان باتوں سے کوئی بحث نہیں، ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اگر ''واضعینِ حدیث'' نے یہود و نصاریٰ سے باتیں حاصل کی ہوتیں، تو اس حدیث کو ہرگز دفاترِ

حدیث میں جگہ نہ دیتے، اس لیے کہ اس سے ان کو سخت نقصان پہنچتا ہے، اوران کے فعل کی مذمت نکلتی ہے۔

''حق گو'' صاحب کی خبط الحواسی ''حق گو'' صاحب غایت بدحواسی کے عالم میں لکھتے ہیں کہ:

''یہودیوں میں اولین فرائض وہی تھے، جو ہمارے ہاں ہیں، یعنی صلوٰۃ، صیام وزکوٰۃ، مگر جب مثنا کا رواج یہودیوں میں ہوا، تو انھوں نے نمازیں اور روزے ضائع کر دیے، اور زکوٰۃ کی جگہ سود لینے لگے، اور لگے قربانی اور سبت اور اس طرح کے طفلانہ احکام پر سختی سے عمل کرنے، اس لیے شام وعراق میں یہودیوں کے ساتھ بود و باش کرنے میں مسلمانوں نے انھیں اعمال کی نقل کی، جن کا اصل ماخذ مثنا تھا''

لیکن کیا ''حق گو'' صاحب ذرا اپنے حواس درست کر کے یہ بتا سکتے ہیں، کہ حدیثوں میں سبت کی تعظیم اور ان کے احکام کا ذکر کس جگہ ہے جو یہودیوں میں رائج تھے؟ اسی طرح قربانی کے احکام جو مثنا میں درج ہیں، اور یہودیوں کا ان پر عمل درآمد تھا وہ حدیث یا فقہ میں کہاں ہیں؟ ''حق گو'' صاحب! آپ جھوٹ تو بولتے ہیں، لیکن آپ کو جھوٹ بولنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے، آپ اگر آنکھیں کھول کر دیکھتے، تو آپ کو نظر آتا کہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں سب سے پہلے پاکی، اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ابواب نہایت جلی خط میں لکھے ہوئے ہیں، اور سبت وقربانی یہود کا کوئی ذکر نہیں ملتا، پس اگر مسلمانوں نے یہودیوں کے اعمال کی نقل کی ہوتی، تو اس کے برعکس ہوتا؛ اگر عقل ہوتو سوچیے کہ جب یہودیوں نے نماز، روزہ کو بھلا دیا تھا، اور زکوٰۃ کی جگہ سود لینے لگے تھے، اور مسلمان بقول آپ کے انھیں کے مقلد تھے، تو مسلمانوں نے کیوں اور کہاں سے نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کے مسائل کی تفصیل حدیث وفقہ میں لکھی، اور خواہ مخواہ کے لیے اتنے جھگڑے اپنے سر لے لیے؟ اور جواز

سود جیسے ''سودمند'' مسئلہ کو قبول کرنے بجائے اپنی کتابوں میں ''ابواب الربا'' کے عنوانات قائم کر کے سود لینے کی ہزاروں برائیاں اور سودی لین دین کی صدہا صورتیں لکھ کر ان کو حرام قرار دے لیا، اور وسائلِ معاش کو اپنے اوپر تنگ کر لیا؟ بلکہ اگر آپ تتبع سے کام لیتے، تو آپ کو حدیثوں میں صاف لکھا ہوا ملتا کہ سبت کے احکام یہود کے ساتھ مخصوص تھے، مسلمان ان احکام کے مکلّف نہیں ہیں، بتایئے کہ جب واضعینِ حدیث یہود کے مقلد تھے، تو یہ حدیث انھوں نے کیوں وضع کی؟

تصویر کی حرمت وحلت کا مسئلہ

''حق گو'' صاحب نے تقلیدِ یہود کی مثال میں تصویر بنانے کی حرمت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ:

''تصاویر کے متعلق قرآن میں کوئی وعید نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف سلیمان کے تذکرہ میں وارد ہے ﴿یعملون له ما یشاء من محاریب و تماثیل﴾ البتہ مثنا میں ربیوں نے تصاویر کی سخت ممانعت کی ہے''

''حق گو'' صاحب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں تو تصویر کی ممانعت ہے نہیں، لہذا مسلمانوں نے بہ تقلید یہود اس کی حرمت کی حدیثیں بنالیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس تقلید میں مسلمانوں کا کیا فائدہ تھا؟ تصویر کو حرام کرنے سے ان کو کس دنیاوی منفعت کی توقع تھی کہ انھوں نے بخیالِ ''حق گو'' صاحب قرآن کو چھوڑ کر یہودیوں کی پیروی کی؟ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ انسان اپنا مذہب چھوڑ کر بلا وجہ اور بے غرض بی دینی اختیار نہیں کرسکتا، اور جب کہ ''حق گو'' صاحب کے خیال میں حکومتوں کی سرپرستی میں حدیث وضع کی گئی ہے، اور بادشاہ عموماً عیاش اور شہوت پرست تھے، تو اب تصویر کی حرمت صرف بے وجہ اور بے فائدہ ہی نہیں رہے گی، بلکہ بادشاہانِ وقت کی عیاشی اور شہوت پرستی کے لیے بے حد مضر بھی ہوگی، پس تعجب ہے کہ ایسی چیز واضعینِ حدیث نے کیوں وضع کی؟ اور بادشاہوں نے اس سے کیوں نہیں روکا؟ بالخصوص جب کہ وہ قرآن سے اس کا جواز دکھلا کر واضعین حدیث کے خلاف عوام الناس کے جذبات کو بھی برانگیختہ کر سکتے تھے اور بزور اس کو روک سکتے تھے، پھر وہ واضعینِ حدیث بھی کیسے سادہ لوح تھے، کہ انھوں نے قرآن کو بھی چھوڑ دیا اور اپنے محسنوں اور بادشاہوں کو بھی خوش نہ کرسکے، ''حق گو'' صاحب! ہوش میں آؤ اور سوچو

کہ ایسی بے عقلی کوئی انسان کیسے کرسکتا ہے؟ پھر ذرا یہ بھی بتاؤ کہ جب تمھارے نزدیک گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی بات کے قرآن میں مذکور ہونے سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، تو تم نے ڈاڑھی کے ان احکام پر جو احادیث میں مذکور ہیں، کیوں طعن کیا؟ اور اس کو یہودیوں کی تقلید کیوں کہا؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں موجود ہے؟ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاڑھی رکھنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، قرآن میں ہے کہ: ﴿لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِي وَ لَا بِرَاْسِي﴾ یعنی اے بھائی موسیٰ! میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑو، اسی طرح قتل مرتد پر کیوں معترض ہوئے، جب کہ مرتدین بنی اسرائیل کی سزا قرآن میں قتل ہی مذکور ہے۔

''حق گو'' کی شرمناک غلط بیانی اس کے بعد میں ''حق گو'' صاحب کی اس مشقِ دروغ بافی کی داد دوں گا، کہ انھوں نے نہایت دلیری سے یہ لکھ دیا کہ:

''آنحضرت کے جھنڈے پر عقاب کی تصویر بنی ہوئی تھی''

کیوں صاحب! آپ نے اس جھنڈے کو دیکھا ہے؟ اگر نہیں دیکھا ہے تو آپ کو کس کے بیان سے معلوم ہوا؟ اور اس کا بیان آپ تک کس طرح پہنچا؟ اور آپ نے اس سلسلۂ رواۃ پر کس طرح اعتبار کرلیا؟ جس کے ذریعہ آپ کو یہ معلوم ہوا ہے؟ کیا آپ کو شرم نہیں معلوم ہوتی، کہ روایت کو آپ مردود بھی قرار دیتے ہیں اور پھر اسی سے کام بھی لیتے ہیں؟

پھر اگر کسی روایت میں یہ ذکر ہوتا تو بھی غنیمت تھا، اور اس صورت میں آپ ایک ہی گناہ کے مرتکب ہوتے (یعنی استدلال بالروایۃ کے) لیکن لطف تو یہ ہے کہ اس روایت ہی کا کہیں وجود نہیں ہے، سیر میں صرف اتنا ہے کہ آپ کے ایک جھنڈے کا نام ''رایۃ العقاب'' تھا، لیکن یہ کہ اس میں عقاب کی تصویر بنی تھی، ''حق گو'' صاحب

کا اضافہ اور افترا ہے، اس جھنڈے کا نام ''رایۃ العقاب'' اس لیے نہیں پڑا تھا کہ اس میں عقاب کی تصویر تھی، بلکہ وہ عقاب کی طرح بلندی میں اڑتا تھا، اور اس پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا، اس لیے ''رایۃ العقاب'' کہلاتا تھا، اور فتوح البلدان میں مورخ بلاذری نے لکھا ہے کہ عرب لوگ جھنڈے کو عقاب بھی کہتے ہیں۔

ماکول اللحم جانوروں کی بحث

''حق گو'' صاحب لکھتے ہیں:

''یہود میں کھانے پینے کی چیزوں میں بھی مذہب وایمان کا دخل تھا، چنانچہ کتاب تثنیہ میں ماکولات لحم پر ایک بڑی لمبی فہرست دی گئی ہے، قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ یہودیوں پر یہ حلال وحرام اس لیے تھا کہ اس سے زیادہ کی اہلیت مذہب میں نہ رکھتے تھے، مگر مسلمانوں نے جب یہودیوں کی فہرست دیکھی تو فوراً پنجہ دار جانوروں اور کیچلی دار جانوروں کی حرمت کی حدیث وضع ہوگئی''۔

''حق گو'' کی قرآن مجید پر تعریض

''حق گو'' صاحب نے اس عبارت میں قرآن مجید پر سخت تعریض کی ہے، ان کے اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے، کہ کھانے پینے میں مذہب وایمان کا دخل نہ ہونا چاہئے، حالانکہ قرآن خود بہت سی چیزوں کو مذہباً حرام وناجائز بتاتا ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ یعنی تمھارے لیے سب چوپائے حلال کیے گئے ہیں، مگر وہ جن کی تلاوت آگے کی جائے گی،

پھر اس اجمال کی تفصیل یوں کی گئی:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَا اَكَلَ السَّبُعُ یعنی حرام کیا گیا تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ چیز جس پر غیر خدا کا نام پکارا گیا اور جو جانور مرا ہو گلا گھٹنے سے اور چوٹ سے اور بلندی سے گر کر اور سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا پھاڑنے والے جانور نے، مگر

إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ — جو تم نے ذبح کرلیا ہو، اور (حرام ہے) جو ذبح کیا گیا ہو کسی تھان پر۔

اس کے آگے اسی سورۂ مائدہ میں شراب کی حرمت بھی مذکور ہے، اب ''حق گو'' صاحب بتائیں کہ مذہب و ایمان کا دخل کھانے پینے کی چیزوں میں بھی قرآن سے ثابت ہوا یا نہیں؟ اور انھوں نے منقولۂ بالا عبارت میں قرآن کے صریح احکام کی مخالفت و تکذیب کی یا نہیں؟ ناظرین ''حق گو'' صاحب کی اس عبارت کو پڑھیں اور ہمارے اس قول کی تصدیق کریں جس کو ہم نے مقدمہ میں لکھا ہے، کہ انکارِ حدیث کا منشا بجز بے دینی اور مذہب سے آزادی حاصل کرنے کے اور کچھ نہیں۔

قرآن مجید پر افترا اس کے بعد ہم ''حق گو'' صاحب سے پوچھتے ہیں کہ قرآن میں یہ کہاں مذکور ہے کہ:

''یہود کے لیے حلال و حرام اس لیے تھا کہ وہ اس سے زیادہ کی اہلیت مذہب میں نہ رکھتے تھے''

مہربانی کر کے اس آیت کو نقل کیجئے، جس میں فقدانِ اہلیت کا لفظ ہو، حیرت ہے کہ ''حق گو'' صاحب وضع حدیث کو تو جرم سمجھتے ہیں (اور حقیقۃً ایسا کرنے والا مجرم ہے) لیکن قرآن بنالینا اور خدا پر افترا کر بیٹھنا، ان کے نزدیک کوئی جرم نہیں ہے؟

بنی اسرائیل پر طیبات کے حرام ہونے کی وجہ قرآن میں جہاں اس کا ذکر ہے، وہاں کے الفاظ یہ ہیں:

﴿فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا﴾ — یعنی یہودیوں کے ظلم و معصیت کی وجہ سے اور چونکہ وہ خدا کی راہ سے بہتوں کو روک رہے تھے، اس لیے ہم نے ان پر بہت سی پاکیزہ چیزوں کو حرام کر دیا۔

اور ایک جگہ ہے:

﴿ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُم بِبَغْيِهِمْ﴾ یعنی یہ ان کی سرکشی کا بدلہ تھا

بہر حال جب ان کی سرکشی کی وجہ بہت سی کھانے کی چیزیں ان پر خدا نے حرام کیں، تو ظاہر ہے کہ مذہب کو کھانے کی چیزوں میں دخل ہوا۔

''حق گو'' نسخ کا قائل ہو گیا یہاں پر ''حق گو'' صاحب کو ایک نکتہ سمجھا دینا مناسب ہوگا، ''حق گو'' صاحب اقراری ہیں کہ یہودیوں پر بہت سی کھانے کی چیزیں اللہ نے حرام کیں، اور یہ تحریم ان کی نااہلیت کی وجہ سے تھی، اور ''حق گو'' صاحب اس کا بھی انکار نہیں کر سکتے، بلکہ ان کا عنوانِ کلام اس کو صاف ظاہر کر رہا ہے، کہ شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ میں وہ چیزیں حرام نہیں رہیں، پس ثابت ہوا کہ ایک چیز کو اللہ تعالیٰ ایک وقت میں کسی مصلحت سے حرام کرتا ہے، اور پھر اسی کو حلال کر دیتا ہے، اور اسی کا نام ہماری اصطلاح میں نسخ ہے، پس ''حق گو'' صاحب خود اپنے اقرار سے نسخ کے قائل ہو گئے، لہٰذا ان کا اس مسئلہ پر طعن کرنا ان کی خبط الحواسی کی دلیل ہے۔

''مثنا'' کا صحیح معنی ''حق گو'' صاحب نے اس مقام پر فٹ نوٹ میں مثنا کی تحقیق کی ہے، اور اس کو سُنّت کا مرادف قرار دیا ہے، مگر ''حق گو'' صاحب کی یہ صریح غلطی یا بالقصد فریب کاری ہے، مثنا کے صحیح معنی ''قانون ثانی'' یا ''ڈیوٹرونومی'' کے ہیں، عبرانی زبان کی لغت اور یورپین محققین کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوتا ہے، تفصیل کے لیے معارف نمبر۲ جلد ۲۴، اور نمبر ا جلد ۲۶ ملاحظہ کیجئے۔

''حق گو'' صاحب کی اختلاف بیانی ''حق گو'' صاحب نے ''مسیحیت و حدیث'' کے عنوان کے ماتحت لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں نے ان واقعات کو بھی جو ان کے زمانہ میں پیش آئے

آثار قیامت میں داخل کر دیا، اور اس مضمون کی حدیث بنالی'' (ص ۱۷)

اور اس کے بعد ایک حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں کہ:

''یقیناً یہ قصہ آثارِ قیامت عبداللہ بن زبیر کی جنگ کا واقعہ ہے''۔

حالانکہ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ لکھ چکے ہیں کہ:

''عبداللہ بن زبیر وغیرہ کے واقعات میں سے ایک واقعہ کا بھی اشارہ آثار قیامت کی پیشین گوئیوں میں نہیں ہے''۔

''حق گو'' صاحب! بتائیے آپ کا وہ قول صحیح ہے یا یہ قول؟

''حق گو'' کی ایک عجیب کارروائی اس مقام پر ''حق گو'' صاحب نے ایک اور عجیب کارروائی کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ حدیث مشارٌ الیہ پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ:

''حدیث کا یہ واقعہ ۶۷ھ کا ہے، اور وہ حضرت ام سلمہ کی زبانی نقل کی گئی ہے، حالانکہ حضرت ام سلمہ کا انتقال ۵۹ھ میں ہو چکا تھا''۔

اس اعتراض کو آپ نے ایسے انداز میں ذکر کیا ہے، کہ گویا یہ جناب ہی کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس اعتراض کو نووی نے شرح مسلم میں نقل کیا ہے، اور ''حق گو'' صاحب نے وہیں سے اس کو سرقہ کیا ہے، پھر دوسری کارروائی یہ کی ہے کہ نووی نے وہیں اس کا نہایت مسکت جواب دے دیا ہے، مگر ''حق گو'' صاحب نے از راہِ غایت ''دیانتداری'' اس کو نقل نہیں کیا، نووی نے یہ جواب ذکر کیا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کا انتقال یزید بن معاویہ کے عہدِ حکومت میں ہوا ہے، نہ کہ ۵۹ھ میں، جو حضرت معاویہؓ کا آخری عہدِ خلافت ہے، اور حضرت ام سلمہ کی وفات کی یہ تاریخ ابن عبدالبر نے استیعاب میں اور ابوبکر بن ابی خیثمہ نے ذکر کی ہے، لہذا راوی کے اس قول پر کہ یہ حدیث ہم نے حضرت ام سلمہؓ سے ابن زبیرؓ کے

عہد حکومت میں سنی، کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں شہیدوں کا ذکر اسی عنوان کے ماتحت ''حق گو'' صاحب نے اپنی یہ عجیب تحقیق بھی ذکر کی ہے کہ:

''قرآن شریف میں خدا کی راہ میں مارے جانے والے کو شہید نہیں کہا گیا''۔

لیکن کیا ''حق گو'' صاحب ہم کو یہ بتانے کی زحمت گورا فرمائیں گے، کہ قرآن کریم کی اس آیت میں شہدا کے لفظ سے کس جماعت کو مراد لیا گیا ہے: ﴿أُولَئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَاءِ وَ الصَّالِحِينَ﴾ ''حق گو'' صاحب سے درخواست ہے کہ وہ صدیقین شہداء اور صالحین تینوں کی تعریفیں فرمائیں، اور بتائیں کہ جماعتِ شہداء صدیقین و صالحین سے کس وصف میں ممتاز ہے؟

اختلاف بیانی کی دوسری مثال اختلاف بیانی کی دوسری مثال یہ ہے کہ ''حق گو'' صاحب نے ص ۴ میں لکھا ہے کہ:

''حدیث کی اشاعت عباسیوں کی خلافت میں ہوئی ہے''

اور ص ۳۴ میں لکھا ہے کہ:

''سلطنت کی ہوا خواہی و سرپرستی و توجہ نے گویا روایتِ حدیث کا دروازہ کھول دیا''۔

ان عبارتوں کا مقتضا یہ ہے کہ حدیثوں کے وضع کرنے میں امراء و سلاطین کے جذبات کی رعایت کی گئی ہے، بلکہ ''حق گو'' صاحب نے متعدد جگہ یہ تصریح کی ہے کہ بادشاہوں کے ناروا افعال و حرکات کی تائید کے لیے حدیثیں وضع کی گئیں، پھر اس کے ساتھ ساتھ ص ۱۶ میں حرمتِ تصاویر کی حدیث کا ذکر بھی کرتے ہیں، حالانکہ

خود ص ۲۰ میں تصریح کی ہے، کہ:

''خلفائے عباسی تماثیل وصور میں شریعت کا خیال نہ کرتے تھے، جو ان کو حرام بتاتا تھا، (بتاتی تھی؟)''

''حق گو'' صاحب! کیا کسی صحیح الحواس شخص سے ایسی اختلاف بیانی کی توقع کی جاسکتی ہے؟

تیسری مثال اختلاف بیانی کی تیسری مثال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی بحث میں تو ان کی عمر منگنی کے وقت یعنی ۱۰ھ میں ۱۶/ سال لکھتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بعثتِ نبوی کے وقت وہ پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن ص ۲۷ میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عائشہ اس وقت پیدا بھی نہ ہوئی تھیں''۔

سچ ہے ''دروغ گو را حافظہ نباشد''۔

''حق گو'' صاحب کا انکارِ حدیث کے باوجود حدیثوں سے استدلال

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ''حق گو'' صاحب حدیث کے منکر ہیں، اور انکارِ حدیث کے وجوہ و اسباب ہی کے بیان میں یہ رسالہ انھوں نے لکھا ہے، اور انتہائی بے باکی اور دریدہ دہنی کے ساتھ حدیثوں پر حملہ کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ حدیثوں سے استدلال بھی کرتے جاتے ہیں، ص ۱۴ میں لکھتے ہیں:

''اپنا نکاح خود دو مسلمانوں کی شہادت میں پڑھ سکتا ہے''

یہ نکاح کے لیے دو شاہدوں کی شرط حدیثوں کے سوا قرآن میں کہاں مذکور ہے؟

اور ص ۱۶ میں لکھتے ہیں:

''خود رسول اللہ کا جھنڈا رایۃ العقاب کہلاتا تھا''۔

کیا حدیثوں کے علاوہ اور کہیں اس کا بیان ہو سکتا ہے؟

اور ص ۲۸ میں لکھتے ہیں:

''اس کے بعد لوگ ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، اور اس دوران میں جو وحی نازل ہوئی، اس کو پیچھے رہ جانے والوں نے یادداشت کے طور پر حروف مقطوعات (مقطعات کہیے) لگا کر چھوڑ دیا کہ جب کاتبانِ وحی واپس آئیں گے، تو اس کو اپنی جگہ پر رکھ لیں گے الخ''۔

اگرچہ یہ پورا بیان ''حق گو'' صاحب کا طبع زاد افسانہ ہے، لیکن بفرضِ محال اگر یہ بیان مطابقِ واقعہ بھی ہو، تو کیا سوائے صحابہؓ کے بیان کے جو راویوں کے سلسلہ سے کسی مصنف تک پہنچے، کوئی دوسرا ذریعہ اس کے علم کے لیے ہو سکتا ہے؟ اسی طرح

کسی سورۃ کا مکی ہونا اور کسی کا مدنی ہونا بجز حدیث و روایت کے اور کسی طرح معلوم ہو سکتا ہے؟

پھر ص ۳۰ میں لکھتے ہیں کہ:

''آیت ﴿ما آتاکم الرسول فخذوه﴾ الآیۃ۔ اس موقع پر آئی ہے جب کہ مالِ غنیمت کی تقسیم پر لوگوں کو آں حضرت سے بدگمانی ہوگئی تھی''۔

آیت کا شان نزول بھی ''حق گو'' صاحب کے دماغ کی ایجاد ہے، لیکن اگر بالفرض ثابت بھی ہو تو سوائے حدیث و روایت کے اور کون سی صورت اس کے معلوم ہونے کی ہے؟

وجد و منع بادہ اے زاہد چہ کافر نعمتی است
منکرے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن

''حق گو'' تحریف قرآن کا بھی قائل ہے

''حق گو'' صاحب کے زیر نظر رسالہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف حدیثوں ہی کے منکر نہیں ہیں، بلکہ وہ قرآن کو بھی محرف قرار دے کر در پردہ اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ ص ۲۸ کی منقولہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حروف مقطعات جو قرآن کریم کی بہتیری سورتوں کے اوائل میں ہیں، منزل من اللہ نہیں ہیں، بلکہ صحابہؓ نے اپنی طرف سے یاد داشت کے لیے ان کو لگا دیا ہے (معاذ اللہ) اسی طرح اسی صفحہ میں ان کا یہ لکھنا کہ:

''مدینہ کی لمبی سورتوں میں دو تین سورتیں اکٹھی ہی کر دی گئیں''۔

ان کے قائلِ تحریف ہونے کی واضح دلیل ہے، اس لیے کہ ان کے عنوانِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدنی سورتوں کے درمیان میں مکی سورتوں کے رکھنے کو تعلیم و اشارۂ رسول اللہ ﷺ کے مطابق نہیں، بلکہ صحابہؓ کی ذاتی رائے سے اس کو سمجھتے ہیں۔

اور صفحہ ۲۹ میں تو بالکل بے حجاب ہو کر لکھ دیا ہے کہ:

''یا تو آیت کو تفسیر میں مدغم کر دیا ہے اور یا یہ بھی اس قرآن سے لیا گیا ہے، جو محرف نہ ہوا تھا''

لیجئے! اب تو بلا زحمتِ استدلال یہ ثابت ہو گیا کہ ''حق گو'' صاحب کے نزدیک جس قرآن کی آج تلاوت کی جاتی ہے، وہ محرف ہے (توبہ توبہ) کہئے! اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ انکارِ حدیث کا منشا بجز بے دینی والحاد کے اور کچھ نہیں ہے، اب تو آپ نے دیکھ لیا کہ حدیثوں کو موضوع اور بناوٹی کہہ کر بے کار کر دیا گیا، اور قرآن کو محرف قرار دے کر بے اعتبار بنا دیا گیا، اب کیا چیز رہ گئی جس سے دین و مذہب کے احکام معلوم ہوں، اب جس کا جو جی چاہے کرے، آپ اس کو کسی چیز سے ملزم نہیں کر سکتے۔

مذہبی و اسلامی غیرت کا خون ہم محوِ حیرت ہیں کہ ''حق گو'' صاحب کی اسلامی غیرت کہاں گئی، کہ انھوں نے حفظ و نقلِ اقوال و افعال نبوی اور تدوینِ حدیث کو جو مسلمانوں کا بے نظیر کارنامہ تھا، کذب و افترا قرار دے کر خیر الامم کے دامنِ عزت کو داغدار تو بنایا ہی تھا، اور امتِ مسلمہ کے محدثین، فقہاء، صوفیہ و زہاد اور اصحابِ مغازی و سیر کو یہود و نصاریٰ اور مجوس کا مقلد اور ان کے خیالات کا سرقہ کرنے والا اور کذاب و مفتری اور جابر و ظالم اور شہوت پرست بادشاہوں کا ہوئی خواہ تو کہا ہی تھا، لیکن اس سے بھی دل کی بھڑاس نہ نکلی، اور اس وقت تک ان کو چین نہ آیا جب تک کہ انھوں نے ایک غیر مسلم متعصب اور کور عقل مصنف کا وہ مقالہ اپنی تائید میں نقل نہ کیا، جس میں وہ دشمنِ عقل و خرد لکھتا ہے:

''مانو یہ فرقہ کے لوگ بھی مسلمانوں کی طرح پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے، اور ہر ایک نماز میں کئی رکعتیں بالکل اسی طرح ہوتی تھیں، جیسے اسلامی

شریعت میں، نماز سے پہلے وہ لوگ وضو بھی کرتے تھے اور سال میں تیس دن کے روزے بھی مسلمانوں کی طرح رکھتے تھے، ان کا یہ طریقہ اسلام سے قبل کا ہے، اور قیاس یہ ہے کہ مکہ کے نبی نے اپنی شریعت میں مانویہ شریعت کا نمونہ اختیار کیا ہو۔"

مسلمانو! للہ انصاف! کیا کوئی معمولی مسلمان بھی اس بے غیرتی و بے حمیتی کا مرتکب ہوسکتا ہے؟ کیا کوئی مسلم اس مقولہ کو سننے کی تاب لاسکتا ہے؟ چہ جائیکہ اس سے اپنی کسی بات کی تائید حاصل کرے؟ کیا کوئی مسلمان اپنے نبی اور ان کی شریعت کی یہ توہین گوارا کرسکتا ہے؟

مگر "حق گو" صاحب کی غیرت وحمیت کی داد دیجئے کہ وہ اس ناپاک مقولہ کو انتہائی رواداری کے ساتھ تائیداً نقل کرتے ہیں، اور فٹ نوٹ میں صرف اتنا لکھ کر ہر الزام سے سبکدوش ہوجاتے ہیں:

"اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنحضرت نے کبھی مانویہ فرقہ کے لوگوں کو دیکھا تھا، دوسرے میرا گمان ہے کہ قرآن شریف میں نہ پانچ وقت کی نماز ہے اور نہ تیس دن کے روزے"۔

مگر "حق گو" صاحب! جب یورپین و امریکن مصنفوں کی قیاس آرائیوں اور ان کے تخیلات ہی کو تاریخی شہادتوں سے زیادہ یقینی سمجھتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں اپنے مذہب کے متواترات تک کی تکذیب وتغلیط کردیتے ہیں، تو کیا بعید ہے کہ کوئی دشمنِ اسلام اپنی قیاس آرائی سے مانویہ فرقہ کی ملاقات ثابت کردے، اس وقت آپ کیا کریں گے، ایک یوروپین محقق کی تحقیق کو غلط کہنے کی آپ ہمت نہیں کرسکتے، اس لیے سوائے اس کے کیا چارہ کار ہوگا کہ کریمر کے خیال کو صحیح مان کر ایمان کو خیرباد کہہ دیں (اعاذنا اللہ)

پانچ نمازوں اور تیس روزوں کا ملحدانہ انکار یہ میرا صرف قیاس نہیں ہے، بلکہ ''حق گو'' صاحب نے اپنی اس عادت کا رسالہ زیر نظر میں بکثرت مظاہرہ کیا ہے، خود اسی فٹ نوٹ میں بھی اس کا ثبوت کہ جود ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کریمر کی اس تحریر سے مرعوب ہو کر پانچ وقت کی نمازوں اور تیس دن کے روزوں کا کیسا صاف انکار کر دیا، حالانکہ وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ کریمر کی تکذیب کرتے اور پوچھتے تمھارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ مانو یہ فرقہ اسلام سے پہلے نماز پنجگانہ پڑھتا تھا، اور روزہ ماہانہ رکھتا تھا، کسی مستند تاریخی شہادت سے اس کو ثابت کرو، اس قسم کے بیانات قیاس آرائی سے بمراحل دور ہیں، مگر ''حق گو'' صاحب سے یہ کہاں ممکن؟ اور ان کو یہ ہمت کہاں؟ ان کو تو یورپ کی ہر نہیق پر ایمان لانا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں تیس روزوں کا حکم پھر ''حق گو'' صاحب کی اس جرأت کو بھی دیکھئے کہ قرآن میں پانچ نمازوں اور تیس روزوں کے مذکور ہونے کا انکار کر گئے، حالانکہ تیس روزوں کا صریح حکم قرآن کی اس آیت میں ہے: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (یعنی تم میں سے جو شخص ماہِ رمضان کو پالے، تو اس ماہ کا روزہ رکھے) اللہ اکبر! ایک بے دین ولامذہب کی بات کا تو ''حق گو'' صاحب انکار نہ کر سکے، لیکن قرآن کے صریح حکم کے انکار و تکذیب میں ان کو کچھ تامل نہ ہوا (اناللہ)۔

پانچ نمازوں کا قرآنی کا حکم

اسی طرح نمازوں کا ثبوت قرآن کی متعدد آیت میں ہے، مثلاً: ۱- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّہارِ و زُلَفاً مِنَ اللیلِ؛ ۲- حافظوا علی الصَّلَوَاتِ و الصَّلٰوۃِ الوُسطیٰ؛ ۳- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلوكِ الشَّمسِ الی غَسَقِ اللیلِ و قُرآنَ الفجرِ اِنَّ قرآنَ الفجرِ کانَ مَشہوداً؛ ۴- مِنْ بعدِ صلٰوۃِ العِشاء؛ ۵- مِنْ قبلِ صلٰوۃِ الفجرِ۔ آیت نمبر ۱ سے ثابت ہے کہ دن کے دو کناروں (ابتدا و انتہا) میں دو نمازیں اور رات کی ساعتوں میں بھی کچھ نمازیں پڑھنی چاہئیں، لہذا کم از کم چار نمازیں تو اس سے ثابت ہو گئیں۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲ کو لیجئے تو اس میں صلوات (کم از کم تین) کا پہلے حکم دے کر صلٰوۃ وسطیٰ کا بھی حکم دیا جاتا ہے، لہذا اس سے بھی چار نمازیں ثابت ہوئیں، پھر چونکہ اس آیت میں ایک نماز کو وسطیٰ کہا گیا ہے، یعنی بیچ کی درمیانی نماز، اور چار ماننے میں کوئی نماز درمیانی نہیں ہو سکتی، اس لیے پانچ نمازیں ماننی پڑیں گی، اور دو اِدھر اور دو اُدھر، اور بیچ میں ایک درمیانی ہو سکے، پس جب اس آیت سے پانچ نمازیں ثابت ہوئیں، تو لامحالہ آیت نمبر ۱ میں بھی پانچ ہی مراد ہوں گی، دو دن میں اور تین رات میں، اور خود اس آیت میں بھی دن کے لیے طرفین (تثنیہ کا صیغہ جو دو پر بولا جاتا ہے) اور رات کے لیے زُلَف (جمع کا صیغہ جو کم از کم تین پر بولا جاتا ہے) موجود ہے، جس سے نمازوں کا پانچ کی تعداد میں ہونا ظاہر ہوتا ہے؛ اور آیت نمبر ۳ میں آفتاب کے مائل بہ غروب ہونے کے وقت کی نماز (یعنی مغرب) اور نمازِ فجر کا صریح حکم موجود ہے؛ اور آیت نمبر ۴ میں نمازِ عشاء کا صاف نام موجود ہے؛ اور آیت نمبر ۵ میں نمازِ فجر کا صریح ذکر ہے؛ علاوہ بریں اگر قرآن میں نماز پنجگانہ کا ذکر نہ بھی ہوتا، تو ''حق گو'' صاحب کے لیے اس الزام سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لیے

کہ وہ مسلمانوں کے عمل متواتر کو حجت اور قابلِ عمل مانتے ہیں (دیکھو ص ۳۰) اور ظاہر ہے کہ نماز سے بڑھ کر اور کون سا متواتر عمل ہوگا، لہذا یہ تواتر بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ وقت کی نمازیں پڑھیں، اور لوگوں کو اس کی تعلیم فرمائی، پس عمل متواتر کو حجت مانتے ہوئے "حق گو" صاحب کریمر کے قول کا کیا جواب دیں گے؟

عمل متواتر اور قول متواتر میں کیا فرق ہے؟ یہاں پہنچ کر میں "حق گو" صاحب سے یہ بھی دریافت کروں گا کہ جب تواتر آپ کے نزدیک غلطی سے پاک ہے، تو کیا وجہ ہے کہ عمل متواتر کو تو آپ قابلِ عمل کہتے ہیں؟ لیکن قول متواتر کو قابل تسلیم و تصدیق نہیں کہتے؟ فرض کیجئے کہ پچیس یا پچاس آدمی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے مولیٰ نافع (رضی اللہ عنہم) نے بیان کیا کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فلاں بات بیان کرتے ہوئے سنا، تو آپ کہہ دیں گے کہ وہ پچاسوں آدمی جھوٹ بولتے ہیں، اگر کہیے کہ ہاں! تو معلوم ہوا کہ آپ قول متواتر کو تسلیم نہیں کرتے، اور متواتر چیز بھی جھوٹی ہو سکتی ہے، پس متواتر عمل بھی قابلِ عمل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ جب قول باوجود تواتر کے جھوٹ ہو سکتا ہے، تو عمل بھی باوجود تواتر کے غلط ہو سکتا ہے، اور اگر کوئی فرق ہو تو بیان کیجئے۔

تواتر کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ حدیث نے تواتر کی اہمیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، ورنہ ان کو حدیثوں کا انکار ممکن نہ ہوتا، حالانکہ اس کو نظر انداز کرنا، جیسا کہ میں مقدمہ میں اشارہ کر چکا ہوں، نہایت خطرناک اقدام ہے، عقائد و اعمالِ مذہبی سے قطع نظر کیجئے، تواتر کو بے اعتبار کہنے کے بعد ان مسکینوں کو اپنا صحیح النسب ہونا، اور اپنے والدین کے تعلقات زن وشوئی کا جائز و شرعی ہونا بھی محال ہو جائے گا، جب ہم تواتر کی اس ہمہ گیری پر نظر ڈالتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ دنیا کا کوئی انسان اس سے بے نیاز نہیں ہے، اور نہ اس کو اس کے تسلیم کرنے سے چارہ ہے، تو سخت تعجب ہوتا ہے کہ منکرینِ حدیث نے حدیثوں کے باب میں کیوں اس کا اعتبار نہیں کیا؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کا تو یہ لوگ انکار نہیں کرتے کہ:

"ہندوستان میں گوتم بدھ ایک مصلح گزرا ہے"

لیکن اگر یہ کہا جائے کہ:

"زہری ایک راست باز محدث، امام مالک نہایت دیندار امام حدیث، اور امام احمد ایک خدا ترس صداقت شعار حافظِ حدیث تھے، اور ہزارہا آدمی گواہ ہیں کہ ان حضرات نے اپنے صدہا استاذوں کی زبانی آنحضرت ﷺ کے جن افعال و اقوال کو بیان کرتے سنا، اس کو یاد کیا اور ایک مجموعہ میں جمع کر دیا"۔

تو ہندوستان کے چند افراد بول اٹھتے ہیں کہ یہ سب غلط ہے، یہ ساری باتیں بناوٹی ہیں، حالانکہ ان حضرات کے ہزاروں ہم عصروں نے ان کو حدیثیں سنتے اور ان کو بلا ترمیم و اصلاح قلم بند کرتے ہوئے دیکھا، اور ان کی صداقت و راست بازی کی قول و

فعل سے گواہی دی، اور وہ ساری شہادتیں آج بھی سفینوں میں موجود ہیں، اور سینہ بہ سینہ بھی نقل ہوتی چلی آتی ہیں، اور کوئی ایک قول بھی سینوں یا سفینوں سے ایسا نہیں ملا، جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ یہ حضرات (معاذ اللہ) خود افترا پرداز تھے، یا دوسرے مفتریوں سے یہ باتیں حاصل کی تھیں، پھر ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بھی ''منکرین'' یہی کہتے جاتے ہیں کہ حدیثیں موضوع اور بناوٹی ہیں، بلکہ ان کی صداقت وصحت کی ساری شہادتیں بھی فرضی ہیں، بہت اچھا! لیکن پھر اس کے ساتھ ہی حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت نبی آخر الزماں (علیہم الصلوۃ والسلام) قرآن، توریت، انجیل، اور دنیا کی تمام قدیم کتابوں کا بھی انکار کیجئے، بلکہ اپنی نسب کی صحت وغیرہ کا بھی انکار کیجئے، کہ ان تمام امور کے ثبوت کا مدار بھی خبر، شہادت در شہادت اور تواتر ہی پر ہے۔

''حق گو'' صاحب کی بے باکانہ غلط بیانیاں

''حق گو'' صاحب میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان کو غلط بیانی اور صریح دروغ بافی کرنے میں مطلقاً کوئی عار نہیں معلوم ہوتی، صفحات سابقہ میں ضمناً ایسی مثالیں آپ نے پڑھی ہوں گی، یہاں چند نئی مثالیں لکھی جاتی ہیں:

۱۔صفحہ ۱۵ میں لکھتے ہیں:

''نمرود حضرت ابراہیم کے زمانہ میں تھا ہی نہیں، اس کا زمانہ حضرت نوح کے زمانے سے بھی قبل کا ہے، جیسا کہ توریت سے ظاہر ہوتا ہے''۔

حالانکہ توریت کی کتابِ پیدائش باب ۱۰ میں صراحۃً مذکور ہے کہ نمرود حضرت نوح کا پڑپوتا ہے، اور اس کا نسب نامہ یہ ہے: نمرود بن کوش بن حام بن نوح۔

۲۔صفحہ ۲۳ میں لکھتے ہیں:

''حضرت ابوحنیفہ.........کو کوئی دس بارہ حدیثوں سے زیادہ کا علم نہ تھا''۔

حالانکہ غیر مطبوعہ کو چھوڑ کر صرف مطبوعہ کتابوں سے حضرت سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کی روایت کی ہوئی صدہا احادیث آج بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

۳۔اسی صفحہ میں لکھتے ہیں:

''ابن حنبل کی کتاب مؤطا کے بعد دوسری کتاب ہے''۔

حالانکہ ابوعبید اسد بن موسیٰ، سوریٰ، سعید بن منصور، حمانی، طیالسی، عبدالرزاق وغیرہ (رحمہم اللہ) امام احمد سے پہلے فن حدیث میں کتابیں لکھ چکے تھے۔

۴۔صفحہ ۲۷ میں لکھتے ہیں:

''ورقہ بن نوفل غالباً ایک فرضی شخص ہے، جن کا حضرت خدیجہ سے

رشتہ نہ کوئی عرب کا نساب جانتا ہے، اور نہ ان کی کسی اولاد کا الخ''

حالانکہ ورقہ کے حالات نہایت تفصیل سے مؤرخین نے لکھے ہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان کا نسب نامہ یوں ذکر کیا ہے: ''ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی'' اور تصریح کی ہے کہ ان کا ذکر طبری، بغوی، ابن قانع اور ابن السکن نے کیا ہے، اور اصابہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زبیر بن بکار نے جو بڑے نساب عالم ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔

۵۔ص ۳۰ میں لکھتے ہیں:

﴿ما آتاکُمُ الرَّسولُ﴾ الآیۃ۔ اس وقت آئی جب مال غنیمت کی تقسیم پر لوگوں کو آنحضرت سے بدگمانی ہوئی''۔

حالانکہ یہ شانِ نزول کسی مفسر نے نہیں ذکر کیا ہے۔

''حق گو'' کی کم علمی اور ناواقفیت کی چند مثالیں

''حق گو'' صاحب کی ۔۔۔ مائیگی کی بہت سی مثالیں آپ اوپر پڑھ چکے ہیں، اب چند اور مضحکہ خیز مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ص ۲۳ میں آپ نے ابوبکر قطیعی محدث کو ''ابوبکر قطفی'' اور ان کو امام احمدؒ کا پوتا لکھا ہے۔ اگر ''حق گو'' صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بستان المحدثین کا مطالعہ بھی کیا ہوتا، تو ایسی بے علمی کا مظاہرہ نہ کرتے، ابوبکر قطیعیؒ کا حضرت ابن حنبلؒ سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہے، ان کا نام ونسب یوں ہے: احمد ابن جعفر بن حمدان، اور ابوبکر کنیت ہے۔

۲۔ص ۲۴ میں امام بغوی کا زمانہ دسویں صدی ہجری بتایا ہے، حالانکہ ان کی وفات ۵۱۶ھ میں ہوئی ہے (دیکھو اکمال ص ۴۴)

۳۔اسی صفحہ میں صاحب مشکوٰۃ کو بارہویں صدی کا عالم بتایا ہے، حالانکہ

آٹھویں صدی کے عالم ہیں، اگر "حق گو" صاحب کی نظر مشکوٰۃ پر بھی ہوتی، تو ایسی جہالت کا ظہور ان کے قلم سے نہ ہوتا، مشکوٰۃ کے آخر میں مصنف نے خود اختتام تصنیف کا سال ۷۳۷ھ لکھا ہے۔

۴- اسی صفحہ میں لکھا ہے کہ:

"شافعیوں کے پاس کتاب الام شافعی تھی، گھاٹے میں تھے تو حنفی...... ان کو یقیناً دوسرے اسکول کا ذخیرۂ حدیث دیکھ کر رشک ہوتا تھا...... کہ وہ بے حدیث کے رہے جاتے ہیں، اس لیے انھوں نے وہ چھ مجموعے (صحاح ستہ) چن لیے"۔

اس جہالت کو دیکھئے، ابھی لکھ چکے ہیں کہ مسند احمد مؤطا کے بعد دوسری کتاب ہے، حالانکہ امام شافعی امام احمد سے قدیم ہیں، اس لیے ان کی کتاب الام کو دوسرے نمبر لکھنا چاہیے تھا۔

امام اعظم اور امام ابو یوسف حافظ حدیث تھے دوسری جہالت یہ ہے کہ "حق گو" صاحب محدثین احناف سے بالکل بے خبر ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ خود حافظ حدیث تھے (تذکرۃ الحفاظ ذہبی)، اسی طرح حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ بھی حافظ حدیث تھے (تذکرہ)، حضرت امام محمد رحمہ اللہ کی موطا فن حدیث میں آج بھی موجود ہے، حضرت امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ کی شرح معانی الآثار و شرح مشکل الآثار سے کون ناواقف ہے؟ امام محمد کی کتاب الآثار و کتاب الحج، اس کے علاوہ مسانید امام اعظم بھی ہر جگہ ملتے ہیں۔

تیسری جہالت یہ ہے کہ صحاح ستہ کو تنہا حنفیوں کا انتخاب سمجھتے ہیں، حالانکہ اگر وہ مقدمہ مشکوٰۃ بھی پڑھ لیتے، تو ایسا نہ لکھتے۔

۵- اسی صفحہ میں کلینی کو کتاب کا نام سمجھ رہے ہیں، اور اس کو کافی کے علاوہ

کوئی اور چیز خیال کرتے ہیں، اور اس کے مصنف کا نام یعقوب اور اس کو قاہرہ کا ایک یہودی بتاتے ہیں، حالانکہ کتاب کا نام ''کافی'' ہے، اور مصنف کا نام محمد بن یعقوب، اور کلینی نسبت ہے، کسی کتاب کا نام نہیں ہے۔

صوفیائے کرام پر تہمت ۶۔صفحہ ۲۴ میں لکھتے ہیں:

''صوفیوں کے نزدیک بالکل مباح تھا کہ ترغیب و ترہیب کی جعلی حدیثیں رسول اللہ کے نام سے مشہور کی جائیں۔''

حالانکہ صوفیائے کرام علیہم الرحمۃ اس الزام سے بالکل پاک ہیں، ''حق گو'' صاحب نے اس مدعا پر جس عبارت سے استدلال کیا ہے، اس میں صوفیوں کا کہیں ذکر نہیں ہے، بلکہ بعض متصوفہ کا ذکر ہے، افسوس ہے کہ ''حق گو'' اپنی نادانی کے باعث صوفی اور متصوف میں فرق نہ کر سکے، متصوف بناوٹی صوفی کو کہتے ہیں، یعنی متصوف کا اطلاق اس گروہ کے افراد پر ہوتا ہے، جس کا ذکر انقلاب کے ''افکار و حوادث'' اور زمیندار کے ''فکاہات'' میں اکثر ہوتا رہتا ہے، اور اس گروہ کو کوئی پابندِ شرع اچھی نظر سے نہیں دیکھتا، اور نہ کوئی اس کو صوفیہ صافیہ کی جماعت میں شمار کرتا ہے، لہذا ایسوں کے فعل کی وجہ سے سچے صوفیوں کو بدنام کرنا دیانت کے خلاف ہے، سچے صوفیہ ہرگز اس امر قبیح کے مرتکب نہ تھے، یہ دوسری بات ہے کہ فن حدیث سے ناواقفیت یا حسن ظن کی وجہ سے اپنے کلام میں کوئی موضوع حدیث نادانستہ ذکر کر گئے ہوں۔

۷۔صفحہ ۲۵ میں لکھتے ہیں کہ:

''وضع حدیث کے فتنہ کو دبانے کے لیے جاحظ، ملا علی قاری، ابن جوزی، عسقلانی، شوکانی وغیرہ کا گروہ اٹھا''

سبحان اللہ! کیا معلومات ہیں! یعنی جاحظ بھی اس فتنہ کو دبانے اٹھے تھا؟! اور چھٹی صدی ہجری تک جو ابن جوزی کا زمانہ ہے، کوئی اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے اٹھا

ہی نہ تھا؟

صوفیائے کرام کی دشمنی میں قرآن کا انکار ۸- صفحہ ۲۶ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''صوفیوں نے رسول اللہ کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کیا، مہینوں صومِ وصال رکھوائے، بھوکوں کی شدت سے ان کے پیٹ پر پتھر بندھوائے، ازواجِ مطہرات کو ایک جوڑے کپڑے اور ایک کھجور پر قناعت کرائی الخ''

اس سے زیادہ بے علمی اور کیا ہوگی کہ ''حق گو'' صاحب قرآن کے مضامین سے ایک دم نابلد ہیں، قرآن کریم میں خدا نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا ہے: ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ﴾ اور سورۂ احزاب میں اپنے محبوب نبی کو خطاب کر کے فرمایا کہ اپنی ازواج مطہرات سے کہہ دیجیے ﴿اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِيْلاً﴾ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازواجِ مطہرات دنیا کی آسائش اور مآکل و ملابس کی فراوانی سے محروم تھیں۔

چونکہ میری یہ تحریر توقع سے زیادہ طویل ہوگئی ہے، اس لیے اب صرف ایک بات اور ذکر کر کے اس کو ختم کرتا ہوں۔

موضوعات کی اشاعت کے خلاف حضرات محدثین اور خلفاء کی مساعی جمیلہ

''حق گو'' صاحب نے اپنے رسالہ کے متعدد مقامات میں یہ ظاہر کیا ہے کہ محدثین نے بناوٹی حدیثیں شائع کیں، اور خلفاء نے ان کی سرپرستی کی، حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد بلکہ تاریخی شہادتوں کے خلاف بات ہے، اب موقع نہیں ہے، ورنہ تفصیل وار بتایا جاتا کہ کن کن محدثین اور خلفاء نے فتنۂ وضع حدیث کو دبانے کے لیے کیا کیا کوششیں کیں، اور کس کس محدث نے موضوعات کو صحیح احادیث سے علحدہ کرنے کے لیے کیا کیا خدمت انجام دی، اس لیے صرف دو چار تاریخی واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱- علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ:

''مہدی عباسی کو (جس کی خلافت کا زمانہ ۱۵۸ھ سے ۱۶۹ھ تک ہے) کبوتروں کا بڑا شوق تھا، ایک دن غیاث بن ابراہیم نامی ایک شخص دربار میں آیا، لوگوں نے اس سے فرمائش کی کہ امیر المؤمنین کو حدیث سناؤ! اس نے کہا حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کھر والے اور موزے پہننے والے (یعنی اونٹ) جانوروں اور تیروں اور ڈینے والے جانوروں کے سوا اور کسی چیز میں مقابلہ جائز نہیں ہے۔ مہدی نے اس کو کچھ انعام دیا، اور جب جانے لگا تو کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے، تو نے روپے کے لیے ''ڈینے والے جانوروں'' کا اضافہ کر دیا ہے، تاکہ کبوتروں کا مقابلہ (کبوتر بازی) بھی جائز ہو جائے، اور اس کے بعد حکم دیا کہ تمام کبوتر ذبح کر دیے جائیں، حکم کی دیر تھی سارے شاہی کبوتر آن کی آن میں ذبح کر

دیے گئے‘‘۔

۲- ملا علیؒ قاریؒ نے موضوعات کبیر کے دیباچہ میں اور سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں ابن عساکرؒ سے نقل کیا ہے کہ:

’’ہارون رشید خلیفہ عباسی (جس نے ۱۷۰ھ سے ۱۹۳ھ تک فرائض خلافت انجام دیے ہیں) کے پاس ایک بے دین لایا گیا، ہارون نے اس کے قتل کا حکم سنایا، اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! آپ اُن چار ہزار حدیثوں کو کیا کریں گے، جن کو میں نے بنایا ہے، ان میں کا ایک حرف بھی آنحضرت (ﷺ) کا فرمودہ نہیں ہے؟ ہارون نے اس کے جواب میں کہا کہ: تجھ کو عبداللہ بن مبارک اور ابو اسحٰق فزاری کی بھی خبر ہے، وہ دونوں حضرات حدیثوں کی چھان بین کر رہے ہیں، اور وہ موضوعات کا ایک ایک حرف نکال کر پھینک دیں گے‘‘۔

۳- زمانہ حال کے شہرۂ آفاق مؤرخ مولانا شبلی صاحب نعمانی لکھتے ہیں

’’مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا،............ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ امیر المؤمنین اگر تو آنحضرت (ﷺ) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا، تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے، وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا: تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المؤمنین کے باپ حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں، وہاں موجود تھے، ان کو کس نے پوچھا؟ مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی‘‘

۴- ذہبی کی میزان الاعتدال میں ہے کہ:

''ابن حبانؒ محدث نے ایک شخص کو مکہ میں ایک موضوع حدیث بیان کرتے ہوئے، دیکھ کر کہا کہ اے بڈھے! اللہ سے ڈر اور رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ نہ باندھ، پہلے تو وہ نہ مانا، لیکن جب ابن حبان نے اس کو بادشاہ کا خوف دلایا، تو اس نے قسم کھائی کہ اب مکہ میں حدیث نہ بیان کروں گا۔''

اس قسم کے صدہا واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کبھی بادشاہوں کی خوشامد میں کوئی حدیث بنانا تو درکنار، کسی خوشامدی کی ایسی حرکت دیکھ کر خاموش بھی نہ رہے، فوراً بادشاہ کے منہ پر اس کے جھوٹ ہونے کا اعلان کر دیا، اور اسی پر منحصر نہیں، انھوں نے سلاطین کے کسی ناروا فعل کی خاموشی سے بھی حمایت نہ کی، سعید بن جبیر اور حجاج، امام اوزاعی اور سفاح، امام ابوحنیفہ اور ابن ہبیرہ و منصور، اور امام احمد اور معتصم کے واقعات میرے دعویٰ کی پُر زور شہادتیں ہیں۔

''حق گو'' صاحب نہایت دیدہ دلیری سے یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ:

''مؤطا کی تصنیف حکومت کی سر پرستی میں ہوئی''

حالانکہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ منصور عباسی حاکمِ وقت کے خلاف علویوں کا گروہ تھا، اور امام مالکؒ نے علویوں کی موافقت کی تھی، اور منصور کے خلاف خروج کا فتویٰ دیا تھا، ایسی حالت میں منصور مؤطا کی سر پرستی کیسے کر سکتا تھا، امام مالکؒ کے علاوہ سفیانؒ و ابن عجلانؒ اور دوسرے محدثین پر بھی حکومت نے یہ الزام قائم کیا تھا، اور ان کی گرفتاری کا حکم دے رکھا تھا، علاوہ بریں محدثین وفقہا، امراء و حکام کی ہم نشینی کو نہایت نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اس حالت میں ان سے حکومتوں کو اور حکومتوں سے ان کو کیا توقع ہو سکتی تھی؟ اور اُن میں سے کوئی ایک دوسرے کی حمایت کیونکر کر سکتا تھا؟ تطویل کے خیال سے اشارات پر اقتصار کرتا ہوں، اگر ''حق گو'' صاحب چاہیں گے، تو کسی صحبت میں مؤرخین کی تصریحات بتفصیل پیش کی جائیں گی۔

ایڈیٹر اہل حدیث امرتسر سے ایک شکایت

''حق گو'' صاحب سے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا؛ اب سب سے آخر میں مجھے مولوی ثناء اللہ صاحب ایڈیٹر اہل حدیث سے ایک شکایت کرنا ہے، مجھ کو نہایت تعجب ہوا، جب میں نے دیکھا کہ منکرینِ حدیث کا یہ رسالہ ''ثنائی برقی پریس'' میں طبع ہوا ہے، اور میں نہیں سمجھ سکا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے با ایں ہمہ ادعاءِ عشقِ حدیث دشمنانِ حدیث کے اس الحاد پرور رسالہ کو جس میں حدیث اور محدثین کی تنقیص و تکذیب اور توہین و تحقیر کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا ہے، کیوں اپنے پریس میں طبع کرایا؟ اور ان کی مذہبی حمیت و غیرت نے اس کو کس طرح گوارا کر لیا؟ کیا مولوی صاحب مجھے بتائیں گے کہ یہ **تعاون علی الاثم و العدوان** میں داخل ہے یا نہیں؟ اور کیا حدیث میں دشمنوں کے ہاتھ اسلحہ بیچنے کی ممانعت آئی ہے یا نہیں؟ اگر آئی ہے تو اس میں کیا راز ہے؟ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اس رسالہ کو چھاپ کر آپ خاموش ہو گئے، جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ نے مستقل جواب تو در کنار اپنے اخبار میں بھی شاید اس کی خبر نہیں لی۔

مولوی صاحب! گستاخی معاف! اہل حدیث کہلانے کے لیے تو آپ ہیں، اور حدیثوں سے مدافعت کرنے کے لیے حنفی؟ ؎

فاذا تکون کریهة أُدعیٰ لها   و اذا یحاس الحیس یُدعیٰ جندب

(مطلب یہ کہ) جب کوئی سختی پیش آتی ہے، تو اس کے لیے میں بلایا جاتا ہوں اور جب حلوہ پکتا ہے، تو جندب (ایک شخص کا نام ہے) کو بلایا جاتا ہے۔

هذا آخر الکلام و الحمد لله الکریم المنعام، و صلی الله علی سیدنا محمد خیر الأنام و آله و صحبه الغر الکرام.

تاثر و تبصرہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوب گرامی میں ارشاد فرماتے ہیں:

''میں اپنے ضعف و عذر سے خود شرمندہ ہوں، اور ہدیہ بسر و چشم قبول کرتا ہوں، اور دعائے نافعیت کرتا ہوں، جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا'' اشرف علی

مشہور صاحب قلم اور فاضل ادیب جناب ماہر القادری مرحوم اپنے ماہنامہ ''فاران'' میں نصرۃ الحدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احادیث نبوی کو مجروح کرنے اور انھیں (معاذ اللہ) ناقابلِ اعتبار ٹھہرانے کے لیے منکرینِ رسالت جو وسوسے مسلمانوں کے دلوں میں ڈال رہے ہیں اور جو نکتے تراش رہے ہیں، اس کتاب نے نہ صرف اس کا ازالہ کیا ہے، بلکہ اس قسم کے تمام شیطانی وساوس اور منافقانہ الزامات کی جڑیں کاٹ کر رکھ دی ہیں، اسی دور کا ایک منافق جو ادب و صحافت کی دنیا میں ''حق گو'' کے نام سے مشہور ہے، اس کے ایک ایک الزام کے فاضل مؤلف نے پرخچے اڑا دیے ہیں۔

نصرۃ الحدیث کے مطالعہ سے احادیث رسول کی اہمیت، افادیت، ضرورت، بلکہ اس کے منصوص ہونے پر دل مطمئن ہو جاتا ہے، اس کتاب کا ایک ایک ورق ایمان افروز ہے۔

نصرۃ الحدیث کے فاضلانہ مقدمہ نے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے ''خطبات مدراس'' کی یاد تازہ کردی ہے''۔

ہماری مطبوعات

تحقیق اہل حدیث
صفحات: ۵۲
قیمت: =/۱۵روپے

نصرۃ الحدیث
جدید ایڈیشن
قیمت: =/۸۰ روپے

دستکار اہل شرف
صفحات: ۱۶۰
قیمت: =/۷۰روپے

انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت
صفحات: ۱۲۴
قیمت: =/۳۵روپے

ایثار آخرت
صفحات: ۳۴۰
قیمت: =/۵۰روپے

حیات ابوالمآثر
صفحات: ۷۳۲
قیمت: =/۳۰۰روپے

شارع حقیقی
صفحات: ۸۰
قیمت: =/۲۰روپے

ترغیب الصلوٰۃ
صفحات: ۴۰
قیمت: =/۱۲روپے

مقالات ابوالمآثر
صفحات: ۳۰۶
قیمت: =/۱۲۰روپے

الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ
صفحات: ۱۱۵
قیمت: =/۲۵روپے

رکعات تراویح
صفحات: ۱۲۸
قیمت: =/۳۰روپے

رہبر حجاج
صفحات: ۸۰
قیمت: =/۱۲روپے

اعیان الحجاج
اول: =/۸۰روپے
دوم: =/۶۰روپے

حسن ادب اور اس کی اہمیت
صفحات: ۳۹ جدید ایڈیشن
قیمت: =/۲۰روپے

اہل دل کی دل آویز باتیں
صفحات: ۵۵
قیمت: =/۲۰روپے

دارالاسلام اور دارالحرب
صفحات: ۱۱۷
قیمت: =/۳۵روپے

بیمہ اور اسکا شرعی حکم
صفحات: ۸۰
قیمت: =/۲۵روپے

تعطیل رجال بخاری
صفحات: ۲۵۸
قیمت: =/۸۰روپے

العجیب دائمی تقویم
صفحات: ۳۶
قیمت =/۵روپے

دلیل المخمورات
صفحات: ۱۰۸
قیمت =/۳۵روپے

نماز تراویح کا صحیح طریقۂ نبوی
صفحات: ۵۲
قیمت =/۲۵روپے

پیکر مہر و وفا
صفح[...]
قیمت: [...]

نوٹ: عام خریداروں ک[...]

MADRASA MIRQATUL ULOOM
P.O. BOX No. 1, MAU - 275101 (U.P) INDIA
Ph. 2220469